جلد ۷۹ — مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء — شمارہ ۔ ۲

اس شمارے میں

ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) یو ایس اے

پتہ: ۱۳۱۵ کنگز گیٹ روڈ، کولمبس، اوہائیو ۱۵۰۴-۴۳۲۲۱ (یو ایس اے)

اخبار کے تراشے

توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہے ----؟

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ

"توہین رسالتؐ ثابت ہو جائے تو سزا موت ہے، تاہم اسے ثابت کرنا ایک کام ہے جو عدالت کو کرنے دینا چاہئے کسی کو کسی صورت میں عدالتی عمل پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، خواہ وہ ملک کی کتنی بڑی موثر شخصیت کیوں نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک یہ معاملہ ہے کہ توہین رسالتؐ کی کوئی تعریف آئین میں نہیں کی گئی ہے تو اس ضمن میں یہ کہوں گا کہ توہین رسالتؐ کی تعریف کی ہی نہیں جا سکتی یہ نامعقول بات ہے۔ آپ جو کوئی ہیں سامنے ہیں یہ حقیقت ہے اس کی اس سے جامع تعریف نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی کو اس کی تعریف کرنا ہے تو وہ معاملہ کو الجھانے کے مترادف ہے۔

ہماری عدلیہ کی تاریخ میں جسٹس منیر (ر) وہ شخص تھا جس نے قادیانی کیس کو سب سے زیادہ الجھانے کی کوشش کی۔ وہ ہر عالم دین سے جو عدالت میں گواہی کیلئے یا بیان ریکارڈ کروانے کیلئے آتا، پوچھتا، مسلمان کی تعریف بتاؤ۔ اب مسلمان کی تعریف کیسے ہو سکتی ہے سوائے کلمہ طیبہ پر ایمان لانے کے۔ اس سے بڑی واہیات بات کیا ہو گی۔ اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ یہ جسٹس منیر کی کوشش تھی کہ ۱۹۷۵ء تک مقدمہ سدھر نہ سکا۔ اب جو لوگ توہین رسالتؐ کی تعریف کرنے کی بات کرتے ہیں وہ بھی ویسی ہی حرکت کر رہے ہیں اور اس مقدمہ کو خواہ مخواہ الجھانا چاہتے ہیں۔ توہین رسالتؐ تو بس توہین ہے کوئی بھی اتنا احمق نہیں ہے کہ اسے یہ نہ علم ہو کہ یہ الفاظ آقائے سرورؐ کی شان میں گستاخی ہیں یا نہیں۔ حکومت کی جانب سے قانون میں ترمیم سے متعلق سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ مجھے اس قانون میں کوئی قید نظر نہیں آتی۔ ذہنوں کو الجھانے کی کوشش ہے جو مخصوص طبقہ کی طرف سے چلائی جا رہی ہیں۔ اگر حکومت سمجھتی ہے کہ اس میں کوئی قید ہے تو وہ اس معاملہ کو پہلے علمائے دین کے سامنے رکھے اور انہیں اس پر غور کی دعوت دے۔ اس سوال پر کہ کیا اسے اسمبلی کے سامنے نہیں لے جانا چاہئے۔ انہوں نے کہا "ان لوگوں" کو اس کے بارے میں کیا پتہ مگر چونکہ ملک میں جمہوریت ہے اور ملکی قانون بننے کے لئے ضروری ہے کہ اسے پارلیمنٹ کی منظوری حاصل ہو تو بے شک اسے پارلیمنٹ میں لے جائیں مگر پہلے اسے علمائے کرام سے رائے لے لینی چاہئے۔

اس مسئلہ پر بین الاقوامی رد عمل کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک نے کہا کہ امریکہ اور اس کے حواری مغربی ممالک کے پیٹ میں اس کیس کے حوالہ سے جو مروڑ اٹھ رہے ہیں وہ بے معنی ہیں۔ ان کا اپنا ریکارڈ انسانی حقوق کے حوالے سے صاف نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے حالیہ اقدام میں ڈیوڈ کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے اندر عیسیٰؑ کی روح حلول کر گئی ہے۔ امریکی حکومت نے اسے کسی بھی عدالت میں کسی بھی فورم میں صفائی کا موقع دیئے بغیر اس کے خلاف فوجی آپریشن کیا اور اس کے "معبد" کو آگ لگا دی۔ اس آگ میں اس کے 300 سے زائد افراد جل بسے۔ ان 300 افراد میں اس کے باورچی، چوکیدار، مالی اور معصوم بچے بھی شامل تھے جو اس کے نظریات پر یقین نہیں رکھتے

تھے۔ مگر انسانی حقوق کے اس چیمپئن نے اتنا بڑا ایکشن کیا اور اس پر کسی کو ایک حرف کہنے کی بھی جسارت نہ ہوئی۔ ایسی صورت میں تو وہ ہم سے بھی زیادہ (Fundamentalist) بنیاد پرست ہوئے۔

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا مسلم بنیاد پرست نہیں ہوتا وہ صرف مسلمان ہوتا ہے۔ یہ دراصل انہی کا نظریہ ہے جو انہوں نے ہم پر تھوپ دیا ہے۔ یہ 1920 ۔کی تحریک تھی جو عیسائیت کے بنیادی نظریات کی حفاظت کے لئے شروع کی گئی۔ ان کا ایک فرقہ تھا جو اس کے پیچھے تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ عیسائیت اور جدید علوم ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس لئے انہوں نے مذہب کو بچانے کے لئے تحریک چلائی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں رول آف لا۔ کی یہ حد ہے کہ ان ملزموں کو باقاعدہ عدالت میں لایا گیا، انہیں صفائی کا موقع دیا گیا۔ ڈیوڈ کی طرح صفائی کا موقع دیئے بغیر زندہ نہیں جلایا گیا۔ ہمارے ہاں چونکہ قانون موجود تھا اور یہ قانون ہی دراصل ان کی حفاظت کا ضامن ہے۔ ہمارے ہاں تو ان کے حقوق زیادہ محفوظ ہیں۔ ان کو بیرون ملک تو اپنی جگہ، اندرون ملک وظائف دیئے جاتے ہیں۔ متروکہ وقف املاک بورڈ ان کو وظائف مہیا کرتا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اسلامی مملکت کی حد میں عیسائی اقلیت یا کوئی دوسری اقلیت اس قسم کی حرکت نہیں کرتی تھی۔ یہ باتیں موجودہ دور کی پیداوار ہیں۔ یہ لوگ آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر توہین رسالتؐ کا قانون ختم ہوا تو پھر یہ عدالت میں نہیں قبرستان میں جایا کریں گے۔"

(اخبار "خبریں" ۲۸ فروری ۱۹۹۵ ۔ لاہور)

گستاخی رسولؐ کی سزا موت نہیں، ترمیم مناسب ہے

"لاہور (جواد فیضی، خبریں رپورٹر) جماعت اسلامی مودودی گروپ کے سربراہ سید حیدر فاروق مودودی نے کہا کہ گستاخی رسولؐ کی سزا موت نہیں۔ ڈپٹی کمشنر کی سطح پر کسی افسر سے تفتیش کرانا اور پھر مقدمہ کا اندراج کرانا انتہائی مناسب ہے۔ اسلام میں قتل کی سزا قتل ہے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے گزشتہ روز روزنامہ خبریں سے کیا۔ انہوں نے کہا کہ بنیادی طور پر قانون میں ایسی ترامیم کرنی چاہئیں جس سے ہماری اقلیتوں میں تحفظ کا احساس پیدا ہو۔ انہوں نے کہا کہ توہین رسالتؐ کیلئے عملاً کسی قانون کی ضرورت نہیں۔ کسی شاتم رسولؐ کی کسی بات سے رسول اکرمؐ کی توہین نہیں ہوتی جیسے کسی کے چاند پر تھوکنے سے چاند گندا نہیں ہوتا بلکہ وہ تھوک اسی شخص کے منہ پر پڑتی ہے۔ ایسے ہی گستاخ خود ہی شرمندہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ افسوس کی بات ہے کہ پولیس کی حراست میں منظور مسیح قتل ہوا جس سے بیرونی ممالک میں یہ تاثر ابھرا ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کو تحفظ حاصل نہیں جو غلط ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوئی عالم دین قرآن و شریعت سے ثابت نہیں کر سکتا کہ گستاخ رسولؐ کی سزا موت ہے اور یہ کہ گستاخ رسولؐ کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ توبہ قبول کرنا خدا کا کام ہے بلکہ توبہ تو مرتد کی بھی قبول ہو جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات بھی طے ہونی چاہیئے کہ توہین رسالتؐ کیا ہے؟ آخر کون گستاخ رسولؐ ہوتا ہے؟ اس لئے کہ بریلوی حضرات اہلحدیثوں کو اور اہلحدیث حضرات بریلویوں کو، شیعہ سنی کو، سنی شیعہ کو گستاخ رسولؐ قرار دیتا ہے۔ بلکہ ہمیں چاہیئے کہ تمام علماء کرام سنت نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے آپس کے اختلافات ختم کریں۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے کہا تھا کہ کاروبار مملکت میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہو گا جس پر سب کو عمل کرنا چاہیئے۔"

(روزنامہ "خبریں" لاہور ۲۲ اپریل ۱۹۹۵ء)

کیا اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے؟

حضرت مولانا محمد علی صاحب

لفظ ارتداد افتعال کے وزن پر ہے اور ردّ سے مشتق ہے جس کے معنے واپس لوٹ جانے کے ہیں۔ ردّا اور ارتداد دونوں کے مفہوم میں اس رستہ کی طرف لوٹ جانا پایا جاتا ہے جس رستہ سے کوئی شخص آیا۔ لیکن ردّا کے معنے خاص کر کفر کی طرف لوٹ جانے کے ہیں اگرچہ ارتداد کا لفظ ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور دوسرے معنوں میں بھی (راغب)۔ اور جو شخص اسلام سے کفر کی طرف لوٹ جائے اس کو مرتد کہا جاتا ہے۔ ارتداد کے متعلق بھی ایسی ہی غلط فہمی پائی جاتی ہے جیسی جہاد کے متعلق۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں میں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا موت ہے۔ جس صورت میں اسلام مذہب کی بناء پر کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں دیتا اور جیسا کہ ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ یہ اسلام کا اساسی اصول ہے تو یہ بات کہ کفر مسلمان ہونے کے بعد اختیار کیا گیا یا نہیں کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لئے جہاں تک زندگی کی حرمت کا سوال ہے کافر اور مرتد میں کوئی فرق نہیں دونوں ایک ہی سطح پر ہیں۔

ارتداد اور قرآن مجید

اسلامی قوانین کا اصل سرچشمہ قرآن مجید ہے اس لئے ہم سب سے پہلے اسی کو لیتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کسی جگہ بھی مرتد کا ذکر مبہم طور پر یا کنایۃً بھی نہیں کرتا۔ ارتداد صریح کفر کے اظہار اور اسلام کے صریح انکار کا نام ہے۔ اگر ایک شخص جو اسلام کا اقرار کرتا ہے ایک ایسی رائے کا اظہار کرے یا ایسے فعل کا ارتکاب کرے جو ایک عالم دین یا فقیہہ کے نزدیک غیر اسلامی ہے تو اسے ارتداد نہیں کہا جا سکتا۔ کسی نبی کی توہین یا قرآن مجید کی بے حرمتی کے غلط عذرات اکثر اوقات کسی شخص کو مرتد قرار دینے کے لئے تراش لئے جاتے ہیں اگرچہ وہ شخص واضح اور بین الفاظ میں قرآن مجید اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے کا اعلان کرے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس عام خیال کی کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے قرآن مجید سے ذرہ بھر تائید نہیں ہوتی۔ ایک مستشرق ہیفے منگ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مرتد پر اپنا مضمون ان الفاظ سے شروع کرتا ہے:-

"قرآن مجید میں مرتد کو صرف اگلی دنیا میں سزا کا خوف دلایا گیا ہے۔"

ارتداد کا ذکر آخری مکی سورتوں میں سے ایک میں اس طرح سے آتا ہے:-

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (سورہ النحل ۱۶ : ۱۰۶)

"جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرتا ہے سوائے اس کے جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ مگر وہ جس کا سینہ کفر پر کھل جائے تو ان پر اللہ کی طرف سے غضب ہے اور ان کے لئے عذاب ہے۔"

اس آیت میں صریحاً مرتد کے لئے عذاب اخروی کے وعید کا ذکر ہے اور بعد کی سورتوں میں بھی جبکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے اور اسلامی حکومت قائم ہو گئی اس حکم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ابتدائی مدنی سورتوں میں سے ایک سورت میں ارتداد کا اس جنگ کے ضمن میں ذکر آتا ہے جو کفار نے مسلمانوں کو بجبر مرتد بنانے کے لئے چھیڑی تھی چنانچہ فرمایا:-

وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔ (سورہ البقرہ ۲ : ۲۱۷)

"اور وہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں اگر ان کو طاقت ہو۔ اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھرے، پھر مرجاتے حالانکہ وہ کافر ہی ہو سو یہی ہیں جن کا عمل دنیا اور آخرت میں کام نہ آتے اور یہی آگ والے ہیں وہ اسی میں ہی رہیں گے۔"

قرآن مجید سے مرتد کی سزا موت ثابت کرنے کے شوق میں بعض عیسائی مصنفین نے لفظ فَیَمُتْ (جس کے معنے ہیں "پھر وہ مر جاتے") کے بالکل غلط معنے کرنے میں تامل نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے معنے کئے ہیں "تب اسے مار ڈالا جاتے"۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ فَیَمُتْ فعل معروف ہے اور یَمُوْتُ کے معنے ہیں "وہ مرتا ہے"۔ اس لفظ کا استعمال بتاتا ہے کہ مرتدین کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ بعض مفسرین نے الفاظ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ سے غلط استدلال کیا ہے۔ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسے شخص سے ایک واجب القتل باغی کے طور پر سلوک کیا جاتے۔ اَعْمَالُھُمْ سے وہ نیک اعمال مراد ہیں جو اس نے مسلمان ہونے کی حالت میں کئے اور اس میں شک نہیں کہ ایسے شخص کے اعمال اس دنیا میں بھی کسی کام نہیں آتے کیونکہ ایسا شخص کفر اختیار کر کے برے رستہ پر پڑ جاتا ہے۔ نیک اعمال صرف اسی صورت میں کام آتے ہیں کہ وہ انسان کی اچھی باتوں کی طرف رہنمائی کرتے رہیں اور اعلیٰ زندگی کے شعور کو اس کے اندر ترقی دیتے رہیں۔ دوسری جگہ کسی ایسی قوم کے اعمال حبط ہو جانے کا ذکر آتا ہے جو صرف اس دنیا کے لئے ہی کام کریں اور اعلیٰ زندگی سے تغافل میں رہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ وَلِقَآئِہٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَزْنًا (سورہ کہف ۱۸ : ۱۰۴-۱۰۵) "وہ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں برباد ہوتی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ صنعت کے بڑے اچھے کام بنا رہے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی باتوں اور اس کی ملاقات کا انکار کیا سو ان کے اعمال کسی کام نہ آتے۔ اس لئے ہم قیامت کے دن ان کے لئے وزن قائم نہ کریں گے۔" یہاں حبط اعمال سے مراد یہ ہے کہ جہاں تک اعلیٰ زندگی کا تعلق ہے وہ اعمال بیکار ہیں۔

پس اگر کوئی شخص مرتد ہو جاتا ہے تو اس کو اس دنیا میں سزا نہیں دی جاتے گی بلکہ بوجہ ان اعمال بد کے جن کی طرف وہ لوٹ کر گیا دوسری دنیا میں سزا دی جاتے گی اور مسلمان ہونے کی حالت میں جو نیک اعمال اس نے کئے وہ برا رستہ اختیار کرنے کی وجہ سے بے کار ہو جاتے ہیں۔

تیسری سورت یعنی سورت آل عمران میں جو ہجرت کے تیسرے سال نازل ہوئی بار بار ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو مسلمان ہونے کے بعد کفر کی حالت میں لوٹ گئے۔ لیکن ان کی سزا کے متعلق ہمیشہ یہی کہا کہ وہ عقبیٰ میں سزا پائیں گے۔ چنانچہ فرمایا:-

کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ وَشَھِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ (۳ : ۸۵)

"ان لوگوں کو اللہ کس طرح ہدایت کرے جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوتے اور وہ گواہ ہیں کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس کھلی دلیلیں آ چکی ہیں۔"

پھر اس سے آگے فرمایا:-

اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃَ اللّٰہِ (۳ : ۸۶)

"ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے۔"

پھر فرمایا:-

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا (۳ : ۸۹)

"سوائے ان کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی"۔

پھر فرمایا:-

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ (۳ : ۹۰)

"وہ جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے پھر کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔"

یہودی مدینہ میں رہتے ہوئے اسلام کے خلاف منصوبے بنا رہے تھے مگر اس کے باوجود انہیں کوئی سزا نہیں دی گئی یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہرگز نہیں۔

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

"اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا دن کی ابتداء میں اس پر ایمان لے آؤ جو ان لوگوں پر اتارا گیا ہے جو ایمان لاتے۔ اور اس کے آخر میں انکار کر دو تاکہ وہ لوٹ آئیں۔" (۳ : ۷۲)

اب مقام غور ہے کہ اگر ارتداد کی سزا موت ہی تھی تو ایک اسلامی حکومت کے تحت رہتے ہوئے اسلام کو بدنام کرنے کے لئے یہ لوگ ایسی تجویز کا کیونکر خیال کر سکتے تھے۔ سورہ مائدہ ان سورتوں میں سے ہے جو حضرت نبی کریم صلعم کی زندگی کے آخری دنوں میں نازل ہوئی اور اس میں بھی مرتد کو اس دنیا میں سزا سے بری قرار دیا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (۵ : ۵۴)

"اے وہ لوگو جو ایمان لاتے ہو جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک قوم لائے گا جس سے محبت رکھے گا اور وہ اس سے محبت رکھیں گے۔"

پس جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس میں مرتد کے لئے موت کی سزا کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ جن آیات میں ارتداد کا ذکر ہے وہ اس قسم کی سزا کی تردید کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی آزادی کا وہ (MAGNA CHARTA) منشور اعظم جو سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۶ میں **لا اکراہ فی الدین** کے الفاظ میں دیا گیا ہے اس قسم کے حکم کی علی الاعلان نفی کر رہا ہے۔

حدیث اور ارتداد

اب ہم حدیث کی طرف توجہ کرتے ہیں کیونکہ کتب فقہ نے ان کی سند پر ہی مرتد کے لئے سزائے موت کی بنیاد رکھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض احادیث کے الفاظ میں بعد کے زمانہ کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جب تک اس کے ساتھ دوسرے واقعات شامل نہ ہوتے جن کی وجہ سے مجرم قابل سزا ٹھہرتا تھا محض ارتداد کو قابل سزا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

امام بخاری جو بلاریب جامعین حدیث میں سے سب سے زیادہ محتاط اور ثقہ واقع ہوئے ہیں اس معاملہ میں ان کا طریق واضح ہے انہوں نے اپنی صحیح میں مرتدین کے متعلق دو "کتابوں" میں ذکر کیا ہے۔ پہلی کتاب کا عنوان ہے **کتاب المحاربین من اھل الکفر والردۃ** یعنی "ان کافروں اور مرتدوں کے احکام میں جو جنگ کرتے ہیں"۔ اور دوسری کا عنوان ہے **کتاب استتابۃ المعاندین والمرتدین و قتالھم**۔ یعنی مرتدوں اور باغیوں سے توبہ کا مطالبہ کرنا اور ان سے جنگ کرنا۔ یہ دونوں عنوانات اپنی وضاحت آپ کرتے ہیں۔ پہلی کتاب کا عنوان صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس میں صرف ان مرتدین کا ذکر ہے جو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور دوسری کا عنوان مرتدین کو دشمنان اسلام کے ساتھ شامل کرتا ہے۔ یہ درحقیقت سارے سوال کا مرکزی نقطہ ہے اور اسی امر کی غلط فہمی کی وجہ سے ایک ایسا عقیدہ گھڑ دیا گیا جو قرآن مجید کی صریح تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ

مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ جاری تھی اکثر یہ بات وقوع میں آتی تھی کہ جو شخص مرتد ہو جاتا وہ دشمن کی طرف چلا جاتا اور ان سے مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتا۔ تو اس سے دشمن کے طور پر سلوک کیا جاتا۔ اس وجہ سے نہیں کہ اس نے مذہب بدل لیا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ دشمن کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتا ہے۔ اس وقت ایسے قبائل بھی تھے جو مسلمانوں سے برسرپیکار نہیں تھے اور اگر کوئی مرتد ان کی طرف چلا جاتا تو اس سے کچھ تعرض نہ کیا جاتا۔ ایسے لوگوں کا وضاحت سے قرآن مجید میں ذکر آتا ہے:-

اِلَّا الَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡکُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُہُمۡ اَنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ اَوۡ یُقَاتِلُوۡا قَوۡمَہُمۡ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَہُمۡ عَلَیۡکُمۡ فَلَقٰتَلُوۡکُمۡ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡکُمۡ فَلَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ وَ اَلۡقَوۡا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ سَبِیۡلًا (۴: ۹۰)

"مگر جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے یا تمہارے پاس آئیں اس حال میں کہ ان کے سینے تنگ ہوں کہ تمہارے ساتھ جنگ کریں یا اپنی قوم کے ساتھ جنگ کریں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر قابو دے دیتا سو وہ تم سے ضرور لڑتے پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں پھر تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف کوئی راہ نہیں رکھی۔"

مرتدین کی سزا کا صرف ایک واقعہ جو ایک ثقہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے قبیلہ عکل کے ایک فریق کے متعلق ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا اور مدینہ میں آئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ مدینہ کی آب و ہوا ان کے موافق نہیں اس لئے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں از راہ تلطف مدینہ سے باہر ایک ایسی جگہ بھیج دیا جہاں حکومت کی دودھ دینے والی اونٹنیاں رکھی جاتی تھیں تاکہ وہ کھلی ہوا میں رہیں اور دودھ پئیں۔ وہاں جا کر وہ اچھے بھلے ہو گئے۔ پھر انہوں نے اونٹوں کے رکھوالے کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو ہانک کر لے گئے۔ جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو حضورؐ نے کچھ آدمی ان کے تعاقب میں بھیجے اور انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس روایت میں کوئی ابہام نہیں اور یہ صاف ظاہر ہے کہ انہیں ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے مارا گیا کہ انہوں نے اونٹوں کے رکھوالے کو مار ڈالا تھا۔

اس حدیث پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ:-

مَنۡ بَدَّلَ دِیۡنَہٗ فَاقۡتُلُوۡہُ (بخاری ۸۹: ۲)

جو شخص مذہب تبدیل کر لے اس کو قتل کر دو۔

لیکن مرتدین کے متعلق جو مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں اور دشمنان اسلام سے مل جائیں جو کچھ امام بخاری نے اپنا نقطہ نظر ظاہر کیا ہے اس کے پیش نظر واضح ہوتا ہے کہ اس حدیث میں صرف ایسے مرتدین کا ہی ذکر ہے جو دشمنان اسلام سے مل کر مسلمانوں کے خلاف شمشیر بکف کھڑے ہو جائیں۔ اس حدیث کے معنوں پر صرف یہ قید عائد کرنے سے ہی دوسری احادیث یا قرآن مجید کے بیان کردہ اصولوں سے اس کی تطبیق ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کے الفاظ اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ ان کا ہر تبدیلی مذہب پر خواہ وہ کوئی ہو اطلاق ہو سکتا ہے اور اس طرح سے یہ معنے ہوں گے کہ اگر کوئی غیر مسلم مسلمان ہو جائے یا کوئی یہودی عیسائی ہو جائے تو اس کو بھی قتل کر دینا چاہیئے۔ ایسی بات بالبداہت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی۔ پس اس حدیث کے معنوں پر قید عائد کئے بغیر اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور حدیث جو اس مضمون سے تعلق رکھتی ہے ان معنوں پر جو اوپر بیان کئے گئے مزید روشنی ڈالتی ہے اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان کی جان صرف تین صورتوں میں لی جا سکتی ہے ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ:-

"ایک شخص اپنا مذہب چھوڑتا ہے اور اپنی جماعت کو ترک کر

دیتا ہے" التارک للجماعۃ (بخاری ۸۸ : ۶) اور دوسری قرات کے مطابق المفارق کا لفظ آتا ہے یعنی جو اپنی جماعت سے الگ ہو جاتا ہے۔

بالبداہت جماعت سے علیحدگی یا اس کو ترک کر دینا جو یہاں ایک ضروری شرط قرار دی گئی ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ شخص مسلمانوں کو چھوڑ کر دشمن کے کیمپ میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح سے حدیث کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ جنگ کے زمانہ سے متعلق ہیں اور مرتد کی اس وجہ سے جان نہیں لی جاتی تھی کہ وہ ترک مذہب کرتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر ان دشمنوں سے جاملتا ہے جو مسلمانوں سے برسرپیکار ہیں۔

محض تبدیلی مذہب کی ایک مثال بھی بخاری میں بیان کی گئی ہے ۲۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک اعرابی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپؐ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ابھی وہ مدینہ میں ہی تھا کہ اس کو بخار نے آلیا۔ وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ میری بیعت واپس کر دیجئے۔ حضور صلعم نے انکار فرمایا۔ مگر وہ پھر آیا اور عرض کی کہ میری بیعت واپس کر دیجئے حضورؐ نے پھر انکار کیا۔ وہ پھر آیا اور کہنے لگا کہ میری بیعت واپس کر دیجئے۔ حضور صلعم نے پھر بھی انکار فرمایا اس پر وہ وہاں سے چلا گیا (بخاری ۹۴ : ۴۷) یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ اس شخص نے پہلے اسلام قبول کیا اور دوسرے دن بخار آ جانے پر اس نے خیال کیا کہ یہ بخار اس کو مسلمان ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس لئے وہ آیا اور اس نے بیعت ترک کر دی۔ یہ ارتداد کی صریح صورت تھی لیکن یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا کہ کسی شخص نے اس کو قتل کیا ہو بلکہ اس کے برعکس حدیث کہتی ہے کہ وہ امن و امان سے وہاں سے چلا گیا۔

محض تبدیلی مذہب کی ایک اور مثال ایک عیسائی کی ہے جو مسلمان ہو گیا تھا پھر مرتد ہو کر عیسائیت میں واپس چلا گیا۔ لیکن پھر بھی اسے قتل نہ کیا گیا۔ چنانچہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ:-

"ایک عیسائی تھا جو مسلمان ہو گیا اور اس نے سورۃ البقرہ اور آل عمران پڑھیں اور وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قرآن مجید لکھا کرتا تھا مگر وہ پھر عیسائیت میں چلا گیا اور وہ کہا کرتا تھا کہ محمد (صلعم) کچھ نہیں جانتے سوائے اس کے جو میں (قرآن مجید) کے لئے لکھتا تھا۔ تب خدا نے اس کو موت دیدی اور انہوں نے اس کو دفن کر دیا۔" (بخاری ۶۱ : ۲۵)

حدیث میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ کس طرح زمین نے اس کے جسم کو بھی باہر پھینک دیا۔ بظاہر یہ مدینہ کا واقعہ ہے اور اس وقت سورہ بقرہ اور آل عمران نازل ہو چکی تھی اور اسلامی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ پھر بھی اس شخص سے جس نے ارتداد کیا کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ اگرچہ اس کے جرم کی نوعیت بڑی سخت تھی کیونکہ وہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف توہین آمیز کلمات زبان پر لاتا تھا اور حضورؐ کو نعوذ باللہ مفتری قرار دیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتے سوائے اس کے جو وہ آپؐ کے لئے لکھتا تھا۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید میں ان مرتدوں کا بھی ذکر ہے جو مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے والی قوم کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ پھر ایسے مرتدوں کا ذکر بھی ہے جو جنگ سے قطعاً الگ تھلگ رہتے ہیں نہ مسلمانوں کا ساتھ دیتے اور نہ ان دشمنوں کا۔ اور پھر قرآن مجید یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ایسے مرتدوں سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی بین دلیل ہیں کہ اس حدیث کا جس میں تبدیلی مذہب پر قتل کرنے کا ذکر پایا جاتا ہے ان مرتدین پر ہی اطلاق ہوتا ہے جو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔

ارتداد اور فقہ

اب ہم فقہ کی طرف آتے ہیں کہ ہمارے فقہاء نے پہلے ہی ایک اصول قائم کر لیا ہے جو سراسر قرآن مجید کے خلاف ہے اور

وہ یہ کہ ارتداد کی وجہ سے آدمی کی جان لی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے:-

کہ مرتد کو اسلام پیش کیا جاتے خواہ وہ آزاد ہے یا غلام اگر وہ انکار کرے تو اس قتل کر دینا چاہیئے (ہدایہ جلد ۱ ص ۵۷۶)

لیکن معاً بعد اس اصول کی اس امر سے تردید ہو جاتی ہے کہ مرتد کو ایسا کافر قرار دیا ہے جو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرے (کَافِرُونَ حَرَبِیُّونَ) اور جس کو اسلام کی دعوت پہلے ہی پہنچ چکی ہے۔ (ہدایہ جلد ۱ ص ۵۷۷)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقہ میں بھی مرتد اس وقت قابل قتل ہوتا ہے جب کہ وہ کفار سے مل کر مسلمانوں کے خلاف برسر جنگ ہو اور مرتد عورت کے متعلق تو یہ اصول وضع کیا گیا ہے کہ اسے ہرگز قتل نہیں کرنا چاہیئے۔ ہدایہ میں اس کی وجہ حسب ذیل بتائی گئی ہے:-

"اس بارہ میں ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلعم نے عورتوں کے قتل سے منع فرمایا ہے اور چونکہ جزا و سزا کے لئے قیامت کا دن مقرر ہے اور اس زندگی میں جزا و سزا سے ابتری پھیلتی ہے اور اس اصول کے ترک کرنے کی اجازت صرف فوری فساد کی بناء پر ہو سکتی ہے اور وہ جنگ کی صورت ہے۔ اور عورتوں سے اس میں شمولیت کی توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان کی جسمانی حالت اس قابل نہیں کہ جنگ میں حصہ لے سکیں"

(ہدایہ جلد ۱ ص ۵۷۷)

اس پر شارح نے یہ لکھا ہے کہ ارتداد کی وجہ سے قتل کرنا فرض ہے تاکہ جنگ کا فساد برپا نہ ہو اور یہ فعل کفر کی سزا نہیں ہے (ہدایہ جلد ۱ ص ۵۷۷)

اور پھر لکھا ہے کہ محض کفر کی وجہ کسی آدمی کا مارنا جائز نہیں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح کفار کے خلاف جنگ کرنے کے بارہ میں فقہاء کو غلطی لگی ہے اس معاملہ میں بھی وہ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اور بدیہی طور پر قرآن مجید کے قائم کردہ اصولوں اور فقہاء کے غلط تصورات کے درمیان جو کسی نہ کسی طرح ان کے دماغوں میں راہ پا گئے ایک کشمکش پائی جاتی ہے۔ یہ امر واضح الفاظ میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ مرتد کفر کی وجہ سے نہیں بلکہ جنگ (حراب) کی وجہ سے قابل قتل قرار پاتا ہے۔ اور اس کی دلیل بھی بڑی صفائی سے دے دی گئی ہے کہ محض کفر کی وجہ سے کسی کو قتل کرنا اسلام کے مسلمہ اصول کے خلاف ہے۔ لیکن غلط فہمی یہ ہے کہ محض استطاعت جنگ کو حالت جنگ تصور کر لیا گیا ہے جو بالکل غیر معقول بات ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ مرتد کو جنگ کی طاقت حاصل ہے تو پھر جہاں تک طاقت کا سوال ہے ایک بچے کو بھی حربی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بھی بڑا ہو کر آدمی بن جائے گا اور اسے جنگ کرنے کی طاقت ہو گی۔ خود مرتد عورتیں بھی مستثنےٰ نہیں ہو سکتیں کیونکہ جنگ کرنے کی انہیں بھی طاقت حاصل ہے۔ سزا کا قانون امکانات یا طاقت پر مبنی نہیں بلکہ اصل واقعات یا افعال کے ارتکاب پر مبنی ہے۔ بنابریں فقہ کو بھی یہ اصول مسلم ہے کہ محض تبدیلی مذہب کی وجہ سے کسی کی جان نہیں لی جا سکتی اور جب تک کہ مرتد جنگ نہ کرے اس کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بالکل الگ امر ہے کہ فقہاء نے حراب یا حالت جنگ کی تعریف کرنے میں غلطی کی ہو۔

۱۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ ان کو اذیت دے کر مارا گیا۔ اگر ایسا واقعہ ہوا بھی ہو تو یہ بطور مکافات تھا کیونکہ اسلام کے تعزیری احکام کے نزول سے پہلے مکافات کا قاعدہ دائر و سائر تھا۔ بعض روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قبیلہ عکل کے ان لوگوں نے اونٹوں کے رکھوالے کی آنکھیں نکال ڈالیں اور اسے تپتے ہوئے پتھروں پر پھینک دیا تھا کہ سسک سسک کر مر جائے اس لئے ان سے بھی اسی قسم کا سلوک کیا گیا (عمدۃ القاری جلد ۷ ص ۵۸) لیکن دوسری روایتوں میں اس بات سے انکار کیا گیا ہے کہ ان پر مکافات کا قاعدہ عاید کیا گیا۔ ان روایتوں کے مطابق حضرت نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے ان کو اسی طرح سے اذیت دے کر مارنے کا ارادہ کیا تھا جس طرح انہوں نے اونٹوں کے رکھوالے کو مارا تھا مگر ابھی اس پر عمل نہیں ہوا تھا کہ حضرت نبی کریم صلعم پر ایسے مجرمین کی سزا دہی کے بارہ میں وحی نازل ہوئی۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ اَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ۔ (المائدہ ۵ : ۳۳ جامعہ البیان فی تفسیر القران جلد ۶ ص ۱۲۱۔) یعنی جو اللہ اور رسولؐ کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزا صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا انکے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جاتے۔ یہاں مرتدین کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ کرتے ہیں جرم کی نوعیت کے مطابق سزا بھی بدل جاتی ہے جب مجرم ملک میں دہشت پھیلاتا ہو تو اس کے لئے موت یا صلیب یا محض قید کی سزا ہے۔

توہین نبی صلعم
(۲)

اگر شاہ صاحب قرآن میں ناسخ و منسوخ کے قائل ہیں۔ تو پھر یہ وحی مکی زمانہ کی ہے اور جن آیات میں کفار اور منکرین کی انگلیاں تک کاٹ دینے کا حکم ہے وہ مدنی زمانہ کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو بعد میں حکم آئیگا وہ پہلے حکم کا ناسخ ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ جو حکم منسوخ ہو چکا حضور صلعم اس پر عمل کرتے اور جو نیا حکم نازل ہوا اس کو نظرانداز فرماتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ قرآن شریف میں نہ توہین رسالت کی سزا مقرر ہوئی ہے اور نہ ہی ارتداد کی۔ اور جو آیات شاہ فرید الحق صاحب نے اپنے مضمون میں درج فرمائی ہیں۔ ان کا ان دونوں مسئلوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ سورہ الانفال کا نزول ۲ ہجری میں ہوا۔ اور اس میں جنگ بدر کا زیادہ تر ذکر ہے اور اس کی آیات ۱۲ اور ۱۳ کا تعلق کفار مکہ سے ہے۔ جو مسلمانوں کو مٹانے کے لیئے مدینے پر چڑھ دوڑے تھے اور جن سے بدر کے مقام پر مسلمانوں کی پہلی جنگ ہوئی تھی۔ جب جنگ ہو تو دشمن سے رعایت کس بات کی۔ سو حکم ہوا کہ ان کی گردنوں پر مارو اور ان کی پوریں تک کاٹ ڈالو۔ مطلب یہ کہ جن ہاتھوں سے کفار تم پر تلواریں اٹھاتے ہیں ان ہاتھوں کو کاٹ دو۔ کفار نے تلواریں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اٹھائی تھیں۔ تو اس جرم کی ان کو سزا ضرور ملنی چاہیئے تھی۔ جب تک دشمن نے منظم طور پر حربی طاقت کا استعمال نہیں کیا تھا مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہیں ملی تھی۔ سورہ التوبتہ کی آیات ۶۵ اور ۶۶ کا تعلق منافقین مدینہ سے ہے اور یہ سورت ۹ ہجری میں نازل ہوئی اور اس میں جنگ تبوک کا بھی ذکر ہے۔ تبوک کی طرف لشکر کشی کے موقع پر منافقین کی منافقت پوری طرح عیاں ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ جمعہ میں ان کے نام لے کر ظاہر کر دیا اور انہیں مسلمانوں سے الگ کر دیا اور ان کو مسجد سے نکال دیا گیا اور ان سے زکوۃ لینی بند کر دی۔ نبی اکرمؐ کا یہ سلوک اور فیصلہ منافقین کیلئے عذاب عظیم سے کم نہ تھا۔ مگر ہمارا سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ آیا منافقین کو ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں اور کفار سے سازباز رکھنے کے باعث سوائے مقاطعہ کے

گردن زدنی کی سزا ملی؟ اس کا جواب لا محالہ نفی میں ہو گا۔

تیسری آیت شاہ صاحب نے سورہ الفتح سے درج فرمائی ہے۔ اور اس کو یمامہ کے مرتدین سے جوڑ دیا ہے۔ جنہوں نے مسیلمہ کذاب کو نبی تسلیم کر لیا تھا۔ الفتح کی ساری سورت ایک ہی وقت میں نازل ہوئی اور صلح حدیبیہ کے بعد واپسی کے سفر میں ہوئی اور وہ ماہ ذیقعد ۶ ہجری کے آخری ایام تھے۔ مخلفین کون تھے۔ مدینہ منورہ کے ارد گرد رہنے والے دیہاتیوں میں سے تھے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمرہ کیلئے نہیں نکلے تھے۔ اس سورت میں ان کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔ "پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے کہہ دے کہ تم ایک سخت جنگ کرنے والی قوم کی طرف بلائے جاؤ گے ان کے ساتھ جنگ کرو گے یہاں تک کہ وہ فرمانبردار ہو جائیں۔ پس اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں اچھا بدلہ دے گا اور اگر تم پھر گئے جس طرح تم پہلے پھر گئے تو تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کریگا"۔ (۴۸ : ۱۶)

علامہ عبداللہ یوسف علی اور محمد اسد نے **او یسلمون** کے معنے فرمانبرداری اور اطاعت کے لیئے ہیں مسلمان ہونے کے نہیں لیئے اور سخت جنگ کرنے والی قوم سے مراد فارس اور روم کی نہایت ہی طاقتور اور عسکری سامان حرب کی مالک اور فنون جنگ میں ماہر قومیں لی ہیں۔ جن کا پہلے ہی عرب پر بڑا رعب اور تسلط تھا اور ان کی موجودگی میں عرب محض فرضی طور پر آزاد تھے۔ اس سے مسیلمہ کذاب کی فوج مراد نہیں لی گئی۔ قرآن شریف نے خصوصیت سے کسی قوم کا نام نہیں لیا۔ بعض نے فارس اور روم کے علاوہ ہوازن و غطفان اور بنو حذیفہ کے بھی نام لیئے ہیں۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ نہ قرآن نے اور نہ کسی صحیح حدیث نے اس سخت جنگ کرنیوالی قوم کا نام بتایا ہے۔ اسلیئے ہم حتمی طور پر تعین نہیں کر سکتے۔ مگر مسیلمہ کی قوم تو کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد مولانا فرید الحق تسلیم کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معاندین سے بڑی فراخدلی برتی اور آپؐ نے خود اپنے صحابہ کو منافقین کے قتل سے منع فرمایا۔ جو صاف توہین کا ارتکاب کرتے تھے۔ حضور صلعم کے اس رویے کے حق میں حضرت امام ابن تیمیہ کے تین دلائل شاہ صاحب نے لکھے ہیں جن کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

دلیل اول:-

اگر اس وقت سزا کا اطلاق کر دیا جاتا تو انقلاب عظیم یا سخت گڑ بڑ کا اندیشہ تھا اور بد امنی کی جگہ ذلت کا اٹھالینا بہت آسان تھا۔ گویا ہمارے نبی صلعم نعوذ باللہ مصلحت کوش تھے اور خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ سزا کو اپنی حین حیات میں ملتوی رکھا۔ لیکن امت کو وصیت فرما دی کہ میری رحلت کے بعد سزائے قتل نافذ کر دی جائے۔ کیونکہ اس وقت کسی فتنہ کا اندیشہ نہ رہے گا۔ امام ابن تیمیہ زندہ موجود نہیں ہیں۔ اسلیئے شاہ صاحب سے یہ سوال ہے کہ جب قتل کا حکم نازل ہو چکا تو کیا کسی صحابی بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلعم سے کبھی دریافت کیا تھا کہ یا رسول اللہ جب قتل کا حکم نازل ہو چکا ہے تو اس پر عمل درآمد کیوں نہیں فرماتے اور عبداللہ ابن ابی کے قتل کا کیوں حکم نہیں دیتے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ کوئی حکم نازل ہوا اور نہ کسی صحابی نے ایسا سوال کیا بلکہ اس کے برعکس اس رئیس المنافقین کو اپنا کرتہ بخش دیا اور اس کی نماز جنازہ بھی پڑھ ڈالی۔ رہی بات کسی بڑی گڑبڑ کی۔ تو جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم اس وقت نازل فرماتا ہے جب اس کی واقعی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو کفار سے جنگ کرنے کی اس وقت اجازت عطا ہوئی جب اس کی ضرورت ناگزیر ہو گئی۔ جنگ احد میں مدینہ کے جن یہودی قبائل نے بد عہدی کی تھی ان تمام کو فوراً مدینہ بدر ہی نہیں کیا بلکہ عرب سے ہی نکال دیا گیا۔ کچھ قبیلے دو سو میل دور خیبر میں جا کر آباد ہو گئے اور کچھ ارض شام کی طرف چلے گئے اور کوئی ہنگامہ خیزی نہ ہوئی۔ یہودیوں کا صرف ایک قبیلہ بنی قریظہ مدینہ میں رہ گیا۔

کیونکہ اس نے عہد شکنی نہ کی تھی پھر جنگ حنین ہوئی تو اس قبیلہ نے نہ صرف بد عہدی کی بلکہ مسلمانوں کے خلاف متحارب بھی ہوتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سزا دینے میں تاخیر نہ کی اور ان کے منظور کردہ ثالث سعد ابن معاذ کے فیصلہ کے مطابق جو توریت سے لیا گیا تھا اس قبیلہ کے تمام مرد جو تعداد میں تین صد تھے قتل کر دیئے گئے عورتوں اور بچوں کو لونڈیاں اور غلام بنالیا گیا اور ساری جائداد ضبط کر لی گئی۔ یہ کوئی معمولی نوعیت کا واقعہ نہیں تھا۔ تاہم اس پر بھی کسی جگہ کوئی فتنہ نہ اٹھا اور مسلمانوں کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ حیرت ہے کہ چند گنتی کے منافقوں کے قتل سے ملک گیر طوفان مخالفت کیوں کر اٹھ سکتا تھا۔ وہ لوگ یہودی قبائل سے زیادہ طاقتور تو نہ تھے جو مسلمانوں کا کچھ بگاڑ سکتے۔

دلیل دوم

منافق آنحضرت صلعم کی توہین سر عام نہیں کرتے تھے بلکہ چوری چھپے کرتے تھے۔ اس دلیل کے خلاف شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ منافق حضور صلعم کی غیر مبہم طریقہ سے براہ راست توہین و تذلیل کرتے تھے۔ بہر حال درست بات یہ ہے کہ منافق وہی ہوتا ہے جو بظاہر مسلمان ہو اور درپردہ اسلام کا دشمن اور بدخواہ ہو۔ اگر اس کا اندرونہ صاف منہ پر آجاتے تو پھر یا تو وہ مرتد ہو گا یا کافر۔

دلیل سوم

اس پر مزید کچھ لکھنا ضروری نہیں کیونکہ سورہ الاعراف کی آیت ۱۹۹ پر پیچھے گفتگو ہو چکی ہے۔ میں شاہ صاحب سے یہ کہنے کی معافی چاہتا ہوں کہ امام ابن تیمیہ علیہ الرحمتہ کی یہ دلیلیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد نبوت سے متعارض ہونے کے باعث قابل قبول نہیں۔

ارتداد اور اسلام

علماء اسلام اس بات پر بضد چلے آرہے ہیں کہ جو مسلمان اسلام ترک کرنے کی وجہ سے مرتد ہو جاتے اس کی سزا قتل ہے اور یہ سزا اسلیئے بھی ضروری ہے تا کہ دین کا تقدس مجروح نہ ہونے پائے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے دین کا تقدس محض ظاہرداری سے قائم رہ سکتا ہے یا اس کے روحانی فیوض سے۔ اگر امت اولیاء اللہ کے وجود سے خالی ہو جو خدا تعالیٰ کی ہستی پر زندہ نشان ہوتے ہیں اور جن کے انفاس طیبہ سے مردہ روحیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ تو پھر ظاہری شان و شوکت بھی زوال اور انحطاط کا شکار ہو جاتی ہے اور دین کا کھوکھلا پن دنیا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ قدرتی طور پر انسانی طبائع بے جان مذہب سے اکتا جاتی ہیں۔ آپ تمام مغربی ممالک کا حال دیکھ لیں وہ محض نام کے عیسائی ہیں۔ ان کا اپنے دین سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ وہ اقوام بڑی زیرک اور عقلمند ہیں۔ کسی بات کو بغیر دلیل کے تسلیم نہیں کرتیں۔ اور جو دل میں ہوتا ہے اس کا اظہار برملا کرتی ہیں۔ ان کی سوچ کا یہ عالم ہے کہ حضرت مسیحؑ کو جو انجیل نے پیش کیا ہے ایک افسانوی شخصیت قرار دینے لگے ہیں یورپ اور امریکہ میں گرجے گھر مقفل ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کو عیسائی مذہب سے دلچسپی نہیں رہی۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ عیسائیت ایک بے جان مذہب ہے۔ جس میں چند اخلاقی باتیں ہیں اور شریعت کوئی نہیں۔ ہم مسلمان بھی آئے دن دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہر شعبہ زندگی میں ہماری پوری طرح رہنمائی کرتا ہے۔ مگر کوئی عالم دین اور دانشور یہ نہیں بتاتا کہ نظام اسلامی اپنی کامل شکل و صورت میں دنیا کے کس اسلامی ملک میں قائم ہے۔ میرے خیال میں جب سے خلافت ملوکیت میں بدلی اسلامی نظام حیات میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے۔ کیا ایک قتل مرتد کی سزا کا قانون منظور کرنے سے اسلامی نظام کا قیام ممکن ہو جائیگا یا اس سے صرف منافقین کی تعداد میں اضافہ ہو گا۔ ہر شخص دین محض اللہ کے لیئے اختیار کرتا ہے اور اسے پورا حق پہنچتا ہے کہ جونسا دین اس کو پسند ہو اسے اختیار کرے اور اس پر جبر

کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ جہاں دنیا میں ہر چھ افراد میں پانچ افراد غیر مسلم ہیں اور خدا تعالیٰ ان کے کفر سے بے نیاز ہے اسی طرح اگر چند لوگ مرتد ہو جائیں تو اس کی شان بے نیازی میں کچھ فرق نہیں پڑیگا۔ یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ اگر امت میں اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نہیں ہے اور قومی معاشرہ جسد بے روح ہے۔ تو تشدد قوانین کی بیساکھیوں سے اسلام کی ساکھ زندہ نہیں رہ سکتی۔ جنرل ضیاء الحق نے نظام اسلام کے نام پر قوم سے ووٹ لے کر پانچ سال کیلئے صدارت کا عہدہ سنبھالا تھا۔ مگر اسلام صرف اس کی کرسی کے گرد گھومتا رہا۔ اسلام کا سورج کسی نے سر زمین پاکستان پر طلوع ہوتے نہ دیکھا۔ البتہ ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر سے ملک پر بے چاند سیاہ رات ضرور چھا گئی۔ یاد رکھئے اسلام جو برکات بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیئے لایا ہے جب تک ان کا ملک میں اہتمام نہیں کیا جاتا اس وقت تک ضلالت و گمراہی اور فکری و عملی بغاوت و سرکشی کا کبھی خاتمہ نہیں ہو گا۔

شاہ فرید الحق صاحب نے جو دو حدیثیں پیش فرمائی ہیں وہ خدا تعالیٰ کے اس ارشاد سے صریحاً متصادم ہیں۔ "بے شک وہ لوگ جو ایمان لاتے پھر کافر ہوتے۔ پھر ایمان لاتے پھر کافر ہوتے پھر کفر میں بڑھ گئے تو یہ نہیں کہ اللہ ان کی مغفرت کرے اور نہ یہ کہ ان کو راہ پر سیدھا چلاتے۔ منافقوں کو خبر دیدو کہ ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔ جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں کیا وہ ان کے ہاں عزت چاہتے ہیں تو عزت سب اللہ کے لیئے ہے"۔ (سورہ نساء ۴ : ۱۳۷ تا ۱۳۹)۔ اگر مرتد کی سزا واقعی قتل ہوتی تو بار بار اسلام لانے اور کفر اختیار کرنے کی نوبت ہی کیوں آتی۔ چونکہ دونوں پیش کردہ حدیثیں قرآن شریف اور سنت نبویؐ کی نقیض ہیں اسلیئے قابل التفات نہیں۔ اگر واقعی مرتد کی سزا قتل تھی۔ تو حکومت اسلامی اور قاضی شہر کی موجودگی میں حضرت الموسے اشعریؓ کو خود اس مرتد کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ لہذا یہ حدیث وضعی معلوم ہوتی ہے۔ دوسری حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کچھ مرتد ملحدین حضرت علی کرم اللہ وجہ کے روبرو پیش کیئے گئے تو آپ نے ان کو آگ میں جلوا دیا۔ جب حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے حضرت علیؓ کو کہا کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں ان کو ہرگز نہ جلاتا کیونکہ نبی صلعم کا ارشاد ہے کہ کسی کو وہ عذاب نہ دو جو خدا تعالیٰ دیتا ہے۔ اسلیئے میں نے ان کے قتل کا حکم دیا ہوتا کیونکہ حضور صلعم کا فرمان ہے کہ ایک مسلمان جو اپنا دین ترک کرتا ہے اسے قتل کر دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ حدیث بھی وضعی معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت علیؓ جیسے بے پایاں عالم قرآن اور نبض شناس رسولؐ سے ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ان مرتدین کو بجائے قتل کے آگ میں پھینک کر جلوا دیتے۔ جس کی آپ کو قطعاً اجازت نہ تھی۔ یہ کہانی ان کی ذات اقدس پر بہت بڑا الزام ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن شریف نے مرتد کی سزا قتل ہرگز مقرر نہیں فرمائی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کسی مرتد کو قتل کیا یا کرایا۔ اسلیئے اس حدیث کو درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

مسیلمہ پہلے اسلام لایا تھا۔ پھر اس نے اسلام ترک کر کے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ یہ شخص خود مدینہ چل کر آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور کہا کہ آئیے ہم عرب کو دو برابر حصوں میں بانٹ لیتے ہیں میں اپنے حصے میں اپنی نبوت چلاؤں اور آپؐ اپنے حصے میں۔ یہ واقعہ ۹ یا ۱۰ ہجری میں ہوا۔ اگر قتل مرتد کی سزا کا حکم باری تعالیٰ کی طرف سے آچکا ہوا تھا تو آنحضرت صلعم نے گھر آئے شکار کو ہاتھ سے کیوں جانے دیا۔ کیوں نہ صحابہ کو اس کا سر قلم کرنے کا حکم دیا اور یہ جواب دے کر اسے واپس کر دیا کہ مجھے تمہاری یہ تجویز منظور نہیں۔ میرے اور تمہارے درمیان خدا تعالیٰ خود فیصلہ کرے گا۔ مطلب یہ تھا کہ کاذب نبی خدا تعالیٰ کی گرفت سے کبھی نہیں بچ سکتا اور وہ دنیا میں ہی اپنے انجام بد کو ضرور پہنچتا ہے۔

اب اس مسئلہ کو کماحقہ سمجھنے کیلئے ہم قرآن شریف سے

مزید روشنی حاصل کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالے ہوتا ہے۔ "اور جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائیگا اور حالت کفر میں مرے گا۔ تو یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہوتے" (سورہ بقرہ ۲ : ۲۱۶) یہاں مرتد کے انجام بد کی خبر سنادی ہے مگر قتل کا حکم نہیں دیا۔ دوسری جگہ یوں ارشاد ہوا "مسلمانوں تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پلٹ جاتے گا تو اللہ ایسے لوگوں کو لاتے گا جن کو وہ دوست رکھتا ہو گا اور وہ اس کو دوست رکھتے ہونگے، (المائدہ ۵ : ۵۴)۔ پھر فرمایا "محمدؐ ایک رسول ہیں اور ان سے پہلے تمام رسول گذر چکے۔ پس اگر وہ مارے جائیں یا قتل ہو جائیں۔ تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے اور جو کوئی الٹے پاؤں پلٹ جائیگا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، (آل عمران ۳ : ۱۵۴) یعنی اگر کوئی مرتد ہوتا ہے تو ہوا کرے اللہ کا کیا بگاڑے گا۔ یہاں بھی قتل کی سزا کا ذکر نہیں کیا گیا۔ سورہ مائدہ میں ایک اور مقام پر مسلمانوں کو مخاطب فرما کر کہا "مسلمانو تم اپنے نفس کی خبر رکھو۔ جب تم راہ راست پر قائم رہو گے اور جو گمراہ ہو جائیگا وہ تم کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکیگا" (۵ : ۱۰۵) یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ گمراہ ہونیوالا مسلمانوں کو کوئی گزند پہنچانے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ مگر امام ابن تیمیہ نے یہ توجیہ پیش فرمائی کہ فتنہ و فساد کے احتمال کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل مرتد اور منافق کے حکم کو ملتوی رکھا اور فساد سے بچنے کی خاطر ذلت کو قبول کرنا آسان سمجھا۔

سورہ یونس میں خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "اور اگر تمہارا رب چاہتا تو روتے زمین کے سارے آدمی ایمان لے آتے۔ کیا تم لوگوں پر سختی کرو گے کہ وہ مومن ہو جائیں" (۱۰ : ۹۹)۔ سورہ کہف میں ارشاد ہوا کہہ دے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔ جو چاہے ایمان لاتے اور جو چاہے کافر بنے" (۱۸ : ۲۹)۔ اسی مضمون کو سورہ یونس میں زیادہ واضح فرمایا۔ "کہہ دے اے لوگو تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔ جو کوئی ہدایت اختیار کر گیا وہ اپنے لیئے اور جو گمراہ ہو گا وہ اپنے لیئے۔ میں تمہارے اوپر ذمہ دار نہیں ہوں" (۱۰ : ۱۰۸)۔

ان تمام قرآنی آیات کا لب لباب یہ ہے کہ ہر انسان کو دین کے معاملہ میں حریت کاملہ حاصل ہے اور خدا تعالیٰ نے کسی مرتد، منافق اور کافر کیلئے قتل کی سزا مقرر نہیں فرمائی ماسوائے متحارب ہونے کی صورت میں۔ کیا کوئی عالم دین بالخصوص شاہ فرید الحق صاحب بتا سکتا ہے کہ کلام الٰہی مرتد کے قتل یا سنگساری کے بارے میں کیوں خاموش ہے اور سنت رسولؐ میں بھی اس کی مثال کیوں نہیں ملتی۔ (ختم)

(بقا)

ذریت مبشرہ کی اصل حقیقت

بشارت احمد بقا صاحب

(۱)

سلسلہ احمدیہ کے دونوں فریقوں کے درمیان شروع میں تین مسائل میں اختلاف پیدا ہوا اور وہ مسائل یہ تھے۔ اول یہ کہ آیا حضرت بانی سلسلہ احمدیہ حقیقتاً نبی اور رسول ہیں اور زمرہ انبیاء کے فرد ہیں۔ دوم یہ کہ آیا جو شخص آپکی بیعت میں داخل نہیں خواہ اس نے آپ کا نام بھی نہ سنا ہو وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ سوم یہ کہ سورہ صف کی آیت نمبر ۵ میں جو پیشگوئی بزبان حضرت مسیح ابن مریم ایک رسول کی انکے بعد آنیکی کیگئی ہے جس میں اس رسول کا اسم گرامی احمدؐ بتایا گیا ہے۔ اس کا اصل مصداق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا حضرت مرزا غلام احمد قادیانی۔ جماعت لاہور کا موقف اور عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مرزا صاحب کا اصل دعویٰ محدثیت کا تھا۔ جو آپ نے خدا کے حکم سے کیا تھا اور آپ ہرگز نبی نہیں ہیں۔ اور نبی کا لفظ ہر جگہ آپ نے محض لغوی، مجازی اور ظلی طور پر استعمال کیا ہے۔ دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے دعویٰ کے انکار سے کوئی کلمہ گو شخص کافر اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ تیسرا عقیدہ یہ ہے کہ اسمہ احمد کی پیشگوئی کے حقیقی مصداق صرف حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں نہ کوئی

اور شخص۔ خلیفہ ثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے ان بیان کردہ تینوں عقیدوں میں بڑے زور سے اختلاف کیا۔ لیکن جب اسمہ احمد پر ہمارے بزرگوں نے دلائل قاطعہ وساطعہ کی خلیفہ صاحب پر بھرمار کی تو انہوں نے خاموشی اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ مگر باقی دو عقائد پر باوجود شکست پر شکست کھانے کے وہ بدستور ڈٹے رہے۔

اختلاف کے قریباً چھبیس سال بعد ایک ہنگامی صورت حال سے دو چار ہونیکے باعث خلیفہ صاحب اور علماء قادیان نے ذریت مبشرہ کا شوشہ کھڑا کر دیا۔ جن حالات میں اس نئے مسئلہ نے جنم لیا ان پر گفتگو اس مضمون کے اختتامی مراحل میں کی جائیگی۔

علماء قادیان نے یہ مفروضہ پیش کیا کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی تمام اولاد ذریت مبشرہ ہے۔ یعنی ہر ایک بیٹے کی خدا تعالیٰ نے قبل از وقت حضرت مرزا صاحب کو بذریعہ الہام خوش خبری دی تھی اور تمام اولاد ان الہامی پیشگوئیوں کے مطابق پیدا ہوئی۔ لہذا وہ سب کی سب طیب، صالح اور معصوم عن الخطا ہے۔ اور جب وہ صالح اور طیب ہے۔ تو وہ ضلالت اور گمراہی کا رستہ اختیار کر ہی نہیں سکتی اور وہ لازماً راسخ العقیدہ ہے۔ اور جو سنگین الزامات اسکے بعض افراد پر لگائے جاتے ہیں۔ وہ سب افترا اور کذب کا پلندا ہیں۔ ان دنوں فریق قادیان اپنے قائد کے کردار پر مسلسل الزامات اور انکی وسیع پیمانے پر تشہیر کے باعث بڑی پژمردہ، بددل اور مضطرب ہو رہی تھی۔ اور اسے کسی نہ کسی طرح کا حوصلہ دینا ضروری تھا۔ چنانچہ جماعت کو اپنے قدموں پر مضبوطی سے کھڑے رکھنے کیلئے ذریت مبشرہ کا عقیدہ وضع کر لیا گیا۔

اس تمہید کے بعد اب ہم خدا تعالیٰ سے توفیق پا کر ذریت مبشرہ پر تفصیلی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

حضرت مرزا صاحب نے اپنے تمام لڑکوں کے بارے میں جو سیدہ نصرت جہاں بیگم صاحبہ کے بطن سے پیدا ہوتے خدا سے خبر پا کر مندرجہ ذیل ترتیب سے پیشگوئیاں شائع فرمائیں۔

پہلی پیشگوئی۔ ۱۸۸۰ء کے قریب حضور کو الہام ہوا انا نبشرک بغلام حسین یہ الہام صاحبزادہ بشیر اول کی پیدائش سے ۷ اگست ۱۸۸۸ء کو پورا ہو گیا۔ اس مبشر لڑکے کے ساتھ صفت حسنہ حسین الہام میں بیان کی گئی تھی جس سے مراد ظاہری اور باطنی طور پر خوبصورت بتانا مقصود تھا۔ چنانچہ جب اس بچے کی پیدائش کا وقت قریب آیا تو آپکو ایک اور الہام ہوا۔ "خوبصورت پاک لڑکا تیرا مہمان آتا ہے"۔ یہ الہام حضور نے اپنے ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء کے اشتہار میں شائع فرمایا تھا۔ یہی صاحبزادہ ظاہری اور باطنی طور پر خوبصورت اور پاک تھا۔ جو نو سال کی میعاد کے اندر پیدا ہوا اور پہلی پیشگوئی کا مصداق ٹھہرا۔ مگر وہ بچپن میں ہی فوت ہو گئے اور الہام کے مطابق واقعی حضرت مرزا صاحب کے ہاں مہمان ثابت ہوئے۔

دوسری پیشگوئی۔ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کے اشتہار میں حضرت مرزا صاحب نے اپنے دوسرے بیٹے کی پیدائش کے بارے پیشگوئی شائع فرمائی اور اس میں لکھا "بلکہ ایک اور لڑکا ہونے کا قریب مدت تک وعدہ دیا"۔ دسمبر ۱۸۸۸ء میں حضور کو بذریعہ کشف بتایا گیا کہ وہ لڑکا جس کی خبر ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء والے اشتہار میں دی گئی ہے وہ موجودہ حمل میں پیدا ہو گا چنانچہ اس پیشگوئی کے مطابق حضور کے فرزند مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب جنوری ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کے اشتہار میں حضور نے اپنے گھر پیدا ہونیوالے لڑکے کے بارے میں محض پیدائش کا ذکر فرمایا ہے۔ اسکے ساتھ کسی صفت حسنہ کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔ جو اسکے طیب اور صالح ہونے پر دلالت کرتی۔ اور نہ ہی اسکو حسن واحسان میں اپنی نظیر بیان کیا۔ اور نہ فضل یا فضل عمر اور اولوالعزم قرار دیا۔ نہ انہیں ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء والے اشتہار کا مصداق قرار دیا اور نہ ہی کبھی اشتہار ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کے اس حصہ کا مصداق ٹھہرایا جس میں اولوالعزم محمود کی پیشگوئی کیگئی تھی۔ اور نہ کبھی سبز اشتہار کے صفحہ ۷، ۲۱ میں درج کردہ صفات کا حامل قرار دیا۔ مگر علماء ربوہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر از راہ تحکم ان اشتہاروں میں مذکورہ صفات کا مصداق مرزا محمود احمد صاحب کو ٹھہراتے رہے ہیں اگر احباب تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتے ہوں۔ تو انہیں حضرت مولانا عبدالرحمن مصری مرحوم و مغفور کی تصنیف "شان مصلح موعود" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تمام حقائق کھل کر انکے سامنے آ جائینگے اور کسی ابہام کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔

تیسری پیشگوئی۔ یہ پیشگوئی ۱۸۹۲ء میں کی گئی جس کے الہامی الفاظ یہ تھے۔ سیو لدلک الولد ویدنی منک الفضل ان نوری قریب یعنی عنقریب تیرے ہاں لڑکا پیدا ہو گا اور فضل تیرے نزدیک کیا

جائیگا یقیناً میرا نور قریب ہے۔ اس الہام کے مطابق جناب مرزا بشیر احمد صاحب ۱۲ اپریل ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئے اور وہ حضرت مرزا صاحب کے سیدہ کے بطن سے تیسرے فرزند تھے۔ اس الہام میں بھی خدا تعالیٰ نے پیدا ہونے والے بیٹے کی کسی ذاتی صفت حسنہ کا ذکر نہیں کیا محض پیدائش کی خبر دی گئی۔ اور حضور کو صرف یہ خوشخبری دی گئی کہ فضل تیرے نزدیک کیا جائیگا اور میرا نور یقیناً قریب ہے۔ پیدا ہونیوالے بیٹے کو الہام الٰہی نے فضل اور نور نہیں کہا۔

چوتھی پیشگوئی ستمبر ۱۸۹۳ء میں کی گئی جس کے الفاظ الہامی یہ تھے۔ انا نبشرک بغلام گویا الہام میں صرف ایک بیٹے کی بشارت دی تھی۔ کلام الٰہی میں پیدا ہونیوالے بیٹے کی کسی صفت حسنہ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ چنانچہ اس پیشگوئی کے مطابق صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب ۲۴ مئی ۱۸۹۵ء کو متولد ہوئے۔

پانچویں پیشگوئی ۱۳ اپریل ۱۸۹۹ء کو کی گئی جس کے الفاظ یہ ہیں۔ اصبر ملیا ساھب لک غلاماً ذکیا۔ یعنی تھوڑی دیر صبر کر میں تجھے ایک پاک لڑکا عنقریب عطا کروں گا۔ الہام الٰہی میں لڑکے کو غلاما ذکیا کہا گیا ہے۔ یعنی اس کے ساتھ انکی ایک صفت حسنہ کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے "پاک"۔ اس پیشگوئی کے مطابق ۱۴ جون ۱۸۹۹ء کو صاحبزادہ مبارک احمد صاحب پیدا ہوئے۔ اور یہ حقیقت اہل علم احمدی احباب سے مخفی نہیں ہے کہ صاحبزادہ مبارک احمد پر حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے سبز اشتہار میں بیان کردہ جملہ صفات کو چسپاں کیا تھا۔ مگر حضور کا یہ فرشتہ خصلت صاحبزادہ بھی بچپن میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اور یوں سبز اشتہار والی پیشگوئی متعلقہ مصلح موعود کا مصداق حضور کی ساری اولاد میں سے کوئی نہ نکلا کیونکہ مبارک احمد صاحب کے بعد حضور کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہ پیدا ہوئی۔ مگر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مبارک احمد صاحب کی وفات کے معاً بعد وقفہ وقفہ سے آپ کو مندرجہ ذیل الہامات ہوئے۔

انا نبشرک بغلام حلیم۔
انا نبشرک بغلام حلیم ینزل منزل المبارک
ساھب لک غلاماً ذکیا
رب ھب لی ذریۃ طیبۃ
انا نبشرک بغلام اسمہ یحییٰ

ان الہامات میں صرف یہ ہی نہیں بتایا گیا کہ پیدا ہونیوالا لڑکا مبارک احمد کا عوض ہو گا بلکہ وہ مبارک احمد کی صفات کا بھی حامل ہو گا۔ اب یہ ہم سب کو معلوم ہے کہ یہ موعود بیٹا صاحبزادہ مبارک احمد کے بعد پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس سے خدا تعالیٰ کی منشا صاف طور پر یہ نظر آتی ہے کہ ان صفات کا حامل فرد کسی دوسرے زمانہ میں ضرورت حقہ کے تحت آپکی ذریت میں سے پیدا ہو گا۔

ہم نے پانچوں بیٹوں کی پیشگوئیاں اوپر بیان کر دی ہیں۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ لمبی عمر پانیوالی اولاد محض ذریت مبشرہ ہے۔ اسکو الہام الٰہی میں کسی صفت حسنہ سے متصف نہیں کیا گیا۔ لیکن کم عمر پانیوالے بیٹوں کے ساتھ انکی ذاتی صفات حسنہ کا الہامات میں ذکر موجود ہے۔ یا اس بیٹے کی جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔

جب ہم قرآن حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت ذکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کی خبر دی گئی تو اس خبر کو محض بشارت تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ اس کی ذاتی صفات حسنہ کا ذکر بھی خوب کھول کر کر دیا۔ یہاں حضرت مرزا صاحب نے صاف طور صرف ایک ولد صالح کا ذکر فرمایا اور وہ مصلح موعود ہے باقی اولاد کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔ (آل عمران ۳ : ۳۸،۴۳)
اسی طرح جب حضرت مریم صدیقہ کو بیٹے کی بشارت دی تو وہاں بھی پیدا ہونے والے بیٹے کی صفات حسنہ بھی بیان کر دیں۔ (۳ : ۴۴)
گویا یہ قاعدہ کلیہ بن گیا کہ محض پیشگوئی سے پیدا ہونیوالا بچہ ضروری نہیں کہ صالح اور طیب بھی ہو۔ لیکن جس کے لئے کلام الٰہی میں صفات حسنہ بیان کی گئی ہوں وہ لامحالہ بہرطور ان جملہ صفات حسنہ کا حامل ہوتا ہے۔ یہ آپ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس اولاد کی خوشخبری دی گئی وہ نبی ہوتے۔ حضرت ذکریا علیہ السلام کو جس بیٹے کی خوشخبری دی وہ نبی اللہ ہوتے۔ اسی طرح حضرت مریم صدیقہ کو جس بیٹے کی بشارت دی گئی وہ بھی نبی اللہ ہوا۔ اور سب ہی قرآن شریف میں بیان کردہ صفات حسنہ کے حامل تھے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ انبیاء اور اولیاء کو جب بشارت دی جاتی ہے تو وہ اس صورت میں دی جاتی ہے جب کہ انکی نسل میں اللہ تعالیٰ نے اول درجہ کے صالحین کو پیدا کرنا مقدر کر رکھا ہوتا ہے۔ اور یہ صالحین انبیاء اور صلحا کی کیٹیگری کے لوگ ہوتے

ہیں۔ دوسرے یا تیسرے درجہ کے صالحین نہیں ہوتے۔

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی تصنیف آئینہ کمالات اسلام سے ایک اقتباس پیش کر کے قادیانی حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب خدا تعالےٰ کسی ولی اور نبی کو کسی بیٹے کی خوش خبری دیتا ہے تو وہ بیٹا لازماً صالح اور طیب ہوتا ہے۔ لہذا حضرت مرزا صاحب کے تمام بیٹے صالح اور طیب ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آئینہ کمالات اسلام کی عبارت تمام و کمال پڑھ اور دیکھ لی جائے۔ آئینہ کمالات اسلام کے صفحات ۵۱۸، ۵۱۹ پر حضرت مرزا صاحب نے اس پیشگوئی کی تفصیل اور تفسیر بیان فرمائی جو حضور نے اپنے اشتہار مورخہ ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء میں شائع فرمائی تھی اور جس کا تعلق مصلح موعود سے ہے۔ جہاں تفسیر کو ختم کرتے ہیں وہیں نیچے حاشیہ عربی زبان میں لکھا ہے۔ جس کا اردو ترجمہ یہ ہے :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ مسیح موعود شادی کریگا اور اسکے اولاد ہوگی۔ پس رسول کریمؐ کی اس پیشگوئی میں اس بات کیطرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسیح موعود کو ایک صالح ولد عطا کریگا جو اپنے باپ کے مشابہ ہوگا اور اس میں راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور ولیوں کو بشارت نہیں دیتا مگر اس وقت جبکہ اس نے الصالحین کے پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ اور یہی وہ بشارت ہے جو کئی سال پہلے مجھے دی گئی اور اس دعویٰ سے قبل ہی دی گئی۔"

حضرت مرزا صاحب کی اس عبارت میں ایک لفظ ذریت آیا ہے اور دوسرا الصالحین۔ ذریت کے لغوی معنے نسل کے ہیں اور الصالحین (اسم معرفہ) سے مراد عام صالح انسان نہیں بلکہ مامور من اللہ ہے جو پیدائشی طور پر صالح اور طیب ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ساری امت محمدیہ کو مسلم ہے کہ سوائے انبیاء و رسل اور محدثین کے کوئی شخص پیدائشی طور پر صالح اور طیب نہیں ہوتا اور نہ معصوم عن الخطاء۔ حضرت مرزا صاحب کو خدا تعالیٰ نے مصلح موعود کے بارے میں بشارت دی تھی۔ جو حضور نے ۲۰ فروری کے اشتہار میں شائع فرما دی اور اسی پیشگوئی پر حضور نے آئینہ کمالات اسلام میں مزید روشنی ڈالی۔ تو صاف ظاہر ہے کہ حاشیہ لکھتے وقت بھی آپ کے ذہن میں وہی الصالح اور الطیب مصلح موعود ہی تھا نہ کہ ساری اولاد جو ان الہامات کے تحت پیدا ہوئی جن کو میں اوپر پیشگوئیوں میں درج کر چکا ہوں۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت کی خاطر میں حضرت مرزا صاحب کے ایک خط کا اقتباس درج کرتا ہوں۔ جو حضور نے حضرت مولانا نور الدین علیہ الرحمتہ کو ۸ جون ۱۸۸۶ء کو لکھا تھا۔ حضور فرماتے ہیں :

"آج آپ سے بھی جو میرے مخلص دوست ہیں ایک واقعہ پیشگوئی کا بیان کرتا ہوں۔ شائد چار ماہ کا عرصہ ہوا ہے کہ اس عاجز پر ظاہر کیا گیا تھا کہ ایک فرزند قوی الطاقتین کامل الظاہر و الباطن تم کو عطا کیا جائیگا۔ اس کا نام بشیر ہوگا۔ سو ابتک میرا قیاسی طور پر خیال تھا کہ شائد وہ فرزند مبارک اسی اہلیہ (سیدہ نصرت جہاں بیگم صاحبہ۔ ناقل) سے ہوگا اب زیادہ تر الہام اس باب میں ہو رہے ہیں کہ عنقریب ایک اور نکاح تمہیں کرنا پڑے گا اور جناب الٰہی میں یہ بات قرار پا چکی ہے کہ ایک پارسا طبع اور نیک سیرت اہلیہ تمہیں عطا ہوگی وہ صاحب اولاد ہوگی۔ اس میں تعجب کی بات یہ ہے کہ جب یہ الہام ہوا تو ایک کشفی عالم میں چار پھل مجھ کو دئے گئے۔ تین ان میں سے تو آم کے پھل تھے مگر ایک پھل سبز رنگ کا بہت بڑا تھا وہ اس جہان کے پھلوں سے مشابہ نہیں تھا۔ اگرچہ یہ ابھی الہامی بات نہیں مگر میرے دل میں یہ پڑا ہے کہ وہ پھل جو اس جہان کے پھلوں میں سے نہیں ہے وہی مبارک لڑکا ہے۔ کیونکہ کچھ شک نہیں کہ پھلوں سے مراد اولاد ہے اور جبکہ ایک پارسا طبع اہلیہ کی بشارت دی گئی ہے اور ساتھ ہی کشفی طور پر چار پھل دیئے گئے جن میں سے ایک پھل الگ وضع کا ہے سو یہی سمجھا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۔۔۔ مگر میری دانست میں اس لڑکے کے تولد سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری شادی ہو جائے۔"

(بحوالہ مجدد اعظم جلد اول ص ۱۶۰)۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے حضرت مرزا صاحب نے اپنے تینوں بیٹوں کو جو حضور کی دوسری اہلیہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور لمبی عمر پائی اس دنیا کے عام پھل آم سے تشبیہ دی ہے۔ مگر چوتھے بیٹے کو اس بڑے اور سبز رنگ کے پھل سے تشبیہ دی ہے جو اس دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اور اسکی پیدائش کیلئے ضروری سمجھا ہے کہ پارسا طبع خاتون سے شادی کریں۔ اور یہ بڑا ہی ایمان افروز اتفاق ہے کہ الہامات الہیہ میں بھی ان تینوں بیٹوں کی کوئی عظمت و فضیلت بیان نہیں کی گئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی

طرح وہ بھی اپنے نیک اور پارسا عمل سے اپنی صالحیت ثابت کرنے کے محتاج اور مکلف ہیں۔ اور ان کی حالت بھی ڈاکٹر اقبال کے اس شعر کے عین مطابق ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مگر چوتھا بیٹا پیدائشی طور پر ہی صالح اور طیب ہے اور اپنے باپ کے مشابہ ہے۔ اور لامحالہ وہ ان صلحاءمیں سے ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آتے ہیں۔ حضرت مرزا صاحب نے صاف طور پر اقرار کیا ہے کہ میں نے قیاسی طور پر خیال کیا تھا کہ شائد وہ فرزند مبارک اسی اہلیہ سے ہو گا۔ مگر وہ قیاس درست ثابت نہ ہوا۔

صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب مرحوم (بھائی خلیفہ مرزا محمود احمد صاحب) نے سیرت المہدی جلد اول کے صفحہ ۳۷ پر ایک روائیت با الفاظ ذیل بیان کی ہے:

"بیان کیا مجھ سے حضرت والدہ صاحبہ نے کہ جب میری شادی ہوئی اور میں ایک مہینہ قادیان میں ٹھر کر پھر واپس دہلی گئی تو ان ایام میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مجھے ایک خط لکھا کہ میں نے خواب میں تمہارے تین جوان لڑکے دیکھے ہیں۔ والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ مجھے دو یاد تھے مگر حضرت صاحب فرماتے تھے کہ نہیں میں نے تین دیکھے تھے اور تین ہی لکھے تھے"۔ حضرت مرزا صاحب کی یہ رویا دوسری شادی کے معاً بعد کی ہے۔ اس رویا کو تاریخ نے سچ ثابت کر دکھایا۔ مگر وہ چوتھا بیٹا پیدا نہ ہوا کیونکہ آپ نے تیسری شادی نہ کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصلح موعود کی پیدائش کسی اور زمانہ میں ہونی مقدر ہے۔ اور یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ حضور کی صلبی ذریت سے ہو گا یا روحانی ذریت سے۔

حضرت مرزا صاحب نے آئینہ کمالات اسلام میں مصلح موعود کی پیشگوئی کے ضمن میں حدیث نبویؐ یتزوج ویولد لہ پر بھی اپنے خیال کا اظہار فرمایا۔ جو میں پیچھے نقل کر آیا ہوں۔ آپ نے حاشیہ اربعین نمبر ۳، ص ۳۶ پر بھی اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اور وہ وضاحت طلب ہے۔ حضور نے لکھا: اذکر نعمتی رئیت خدیجتی۔ ھذہ من رحمت ربک یتم نعمتہ علیک لیکون ایۃ للمومنین۔

یہ الہام براہین احمدیہ میں درج ہے اور یہ حصہ اس الہام کا ہے جس میں کئی برس پہلے خبر دی گئی یعنی مجھے بشارت دی گئی تھی کہ تمہاری شادی خاندان سادات میں ہو گی اور اس میں سے اولاد ہو گی تا پیشگوئی حدیث یتزوج ویولدلہ پوری ہو جائے۔ یہ حدیث اشارت کر رہی ہے کہ مسیح موعود کو خاندان سادات سے تعلق دامادی ہو گا کیونکہ مسیح موعود کا تعلق جس سے وعدہ یولدلہ کے مواقف طیب اور صالح اولاد پیدا ہو اعلیٰ اور طیب خاندان سے چاہیے۔ وہ خاندان سادات ہے اور فقرہ خدیجتی سے مراد اولاد خدیجہ یعنی بنی فاطمہ ہے۔"

اوپر درج کردہ تشریح حضرت مرزا صاحب نے محض اپنے اجتہاد سے کی ہے۔ حدیث نبوی میں یتزوج ویولدلہ کے الفاظ آتے ہیں یعنی آنیوالا مسیح شادی کریگا اور اسکے اولاد ہو گی۔ اب حضور کی پہلی بیوی سے جو مغل خاندان سے تھیں حضرت اقدس کے دو بیٹے مرزا سلطان احمد اور فضل احمد پیدا ہوئے۔ دوسری شادی سے تین بیٹے لمبی عمر پانیوالے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ فضل احمد حضور کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے۔ مرزا سلطان احمد صاحب سے تعلقات خاندانی تنازعات کے باعث کشیدہ رہے۔ مگر بایں ہمہ وہ آپ کے حقیقی بیٹے تھے اور شرعاً اور قانوناً حضور کے ایسے ہی وارث تھے جیسے دوسری اہلیہ کی اولاد تھی۔ آپ نے ۱۹۰۱ء میں اپنے دو بیٹوں مرزا بشیر احمد و شریف احمد اور بیٹی مبارکہ بیگم کی آمین لکھی اس میں یہ شعر بھی لکھا:

میری ہر پیشگوئی خود بنا دی
ترا نسلاً بعیدا بھی دکھا دی

۱۸۶۵ء میں حضور کو الہام ہوا۔ ثمانین حولا و قریبا من ذالک او تزید علیہ سنن وتری نسلا بعیدا (تذکرہ ص ۵)۔

ترجمہ: اسی ۸۰ سال یا اس کے قریب یا اس سے چند سال زیادہ اور تو دور کی نسل دیکھے گا۔"

حضور نے اس الہام ربانی کا اپنی نظم میں بطور شکر کے ذکر فرمایا ہے۔

حضرت مرزا صاحب نے اپنے الہام اشکر نعمتی رئیت خدیجتی انک الیوم لذو حظا عظیم اور بعض دوسرے الہامات کی تشریح نشان نمبر ۵۰ مندرجہ تریاق القلوب میں یوں فرماتی ہے:

"سو اس نے ایک نئے خاندان کیلئے مجھے اس الہام میں ایک نئی بیوی کا وعدہ دیا۔ اور اس الہام میں اشارہ کیا کہ جو تیرے لئے مبارک

ہو گی اور تو اس کے لیئے مبارک ہو گا۔ اور مریم کی طرح اس سے تجھے پاک اولاد دی جائیگی۔ سو جیسا کہ وعدہ دیا گیا ایسا ہی ظہور میں آیا اور خدا تعالیٰ نے بذریعہ الہام فروری ۱۸۸۶ میں وعدہ دیا اور پھر ہر ایک پسر کے پیدا ہونے سے پہلے اسکے پیدا ہونے کے بارہ میں وعدہ دیا۔" آپکی تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت مریم کو مسیح کی پیدائش کی خبر دی تھی اسی طرح ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء کے اشتہار میں مصلح موعود کی بشارت حضور کو دی۔ حضرت مسیحؑ کے علاوہ باقی اولاد عام رنگ کی تھی اور انکے بارے میں قرآن شریف سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مبشر اولاد تھی اور اپنے ساتھ صفات حسنہ رکھتی تھی۔ وہی صورت ہمیں حضور کی باقی اولاد کی سمجھنی پڑتی ہے کیونکہ الہامات الٰہی میں ان کی کسی صفت حسنہ کا ذکر نہیں۔ اور حضرت مرزا صاحب کا ساری اولاد کو پاک ٹھرانا محض آپ کا اجتہاد ہے۔

ترا نسلاً بعیدا سے مراد پوتا ہے کیونکہ وہ بعد میں آنیوالی نسل کہلاتا ہے۔ جب آپ نے یہ نظم لکھی تھی تو اس میں الہام الٰہی ترا نسلاً بعیدا بھی لکھ دیا۔ یعنی تو بعد میں آنیوالی نسل بھی دیکھے گا۔ اور یہ الہام مرزا عزیز احمد صاحب ابن مرزا سلطان احمد کی صورت میں پورا ہوتا ہوا حضرت مرزا صاحب نے دیکھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ حدیث نبوی یتزوج ویولدلہ میں دونوں بیویاں اور دونوں کے بطن سے پیدا ہونیوالی اولاد مراد ہے۔ اور یہ اربعین میں جو ۱۹۰۰ء کی تصنیف ہے۔ اپنی دوسری اہلیہ اور انکے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد پر حدیث مذکورہ کو حصر کیا ہے۔ یہ محض حضور کا اجتہاد ہے جو درست نہ نکلا کیونکہ نسلاً بعیدا کا الہام پہلی بیوی کی اولاد کو بھی شامل ظاہر کرتا ہے۔ بنا بریں ہمیں حضرت مرزا صاحب کے اجتہاد کو الہام الٰہی کے بالمقابل چھوڑنا پڑیگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپکے چوتھے بیٹے مرزا مبارک احمد پیدا ہو چکے ہوتے تھے۔ اور حضور نے ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء والی پیشگوئی ان پر چسپاں کر دی تھی جو مصلح موعود کے متعلق تھی اور جس کا پیدائشی طور پر صالح اور طیب ہونا ضروری تھا۔ اسلیئے حضور نے اجتہادی طور پر یتزوج سے مراد صرف سیدہ نصرت جہاں صاحبہ اپنی دوسری اہلیہ کو لے لیا۔ تین جوان بیٹوں کے بارے میں میں اوپر وضاحت سے بتا چکا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے کشف میں حضرت مرزا صاحب کو وہ اس دنیا کے عام پھل آم کے مشابہ دکھاتے تھے۔

اور جو پیشگوئیاں ان کے بارے میں ہوتیں ان کے اندر بھی ان کے ساتھ کسی صفت کا ذکر موجود نہیں۔ جس سے ثابت ہوا کہ وہ تینوں بیٹے پیدائشاً صالح اور طیب نہیں تھے بلکہ پورے طور پر پابند احکام الٰہی ہو کر ہی یہ درجے حاصل کر سکتے تھے۔

اجتہادی غلطیوں کے سلسلہ میں میں حضرت مرزا صاحب کی چند تحریرات پیش کرنا چاہتا ہوں:

(۱) "خدا تعالیٰ کی پیشگوئیاں کبھی ظاہر طور پر پوری ہوتی ہیں اور کبھی استعارہ کے رنگ میں۔ پس کسی نبی کو یہ حوصلہ نہیں کہ ہر جگہ ہر پیشگوئی میں یہ دعویٰ کر دے کہ اسی طور پر یہ پیشگوئی پوری ہو گی" (ضمیمہ براہین احمدیہ، حصہ پنجم، ص ۹۴)۔

(۲) "پھر اس مسلمہ عقیدہ و جمیع انبیاء علیہم السلام سے کیوں منہ پھیر لیا جائے کہ کبھی خدا تعالیٰ کی پیشگوئی ظاہر الفاظ پر پوری ہوتی ہے اور کبھی بطریق استعارہ اور مجاز پوری ہوتی ہے۔"

(۳) مولوی محمد حسین بٹالوی کے اعتراض دربارہ ایضاً ص ۹۵ ولادت مصلح موعود کے جواب میں حضرت مرزا صاحب نے آئینہ کمالات اسلام میں تحریر فرمایا: "اگر آپ کا یہ مطلب ہے کہ پیشگوئی کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا اور مرگیا۔ تو کیا آپ یہ ثبوت دے سکتے ہیں کہ کسی الہام میں یہ مضمون درج تھا کہ وہ موعود لڑکا وہی ہے تو وہ الہام پیش کریں۔ یاد رہے کہ ایسا کوئی الہام نہیں۔ ہاں اگر میں نے اجتہادی طور پر کہا ہو کہ شائد یہ لڑکا وہی موعود لڑکا ہے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو جائیگا کہ الہام غلط نکلا۔ آپکو معلوم نہیں کہ کبھی ملہم اپنے الہام میں اجتہاد بھی کرتا ہے اور وہ اجتہاد کبھی خطا بھی جاتا ہے" (آئینہ کمالات اسلام، ص ۳۸۲)۔

(۴) پھر اس خیال کا اظہار ذرہ مزید وضاحت سے حضرت مرزا صاحب نے تریاق القلوب میں فرمایا "اگر میں نے کوئی کلمہ اجتہادی طور پر کہا ہو اور اپنا خیال ظاہر کیا ہو تو وہ حجت نہیں ہو سکتا اگر اس پر ضد کرو گے تو تمہیں تمام نبیوں سے انکار کرنا پڑیگا اور بجز مرتد اور دہریہ ہو جانے کے کہیں تمہارا ٹھکانا نہ ہو گا" (ص ۷۲)۔

(۵) ازالہ اوہام میں ص ۱۰۴ پر فرمایا۔ "پیشگوئیاں کبھی اپنے ظاہر پر پوری ہوتی ہیں اور کبھی باطنی طور پر ان کا ظہور ہوتا ہے۔"

حضور کے ان واضح ارشادات کی روشنی میں ہم اب یہ کہنے کی پوزیشن میں ہیں کہ اپنی اولاد کے سلسلہ میں جو تشریحات حضورؑ نے اپنے اجتہاد سے کی ہیں اگر وہ درست نہ نکلیں تو اس سے ان کی کوئی کسرِ شان نہیں ہوتی۔ بسا اوقات بعض امور میں انبیاء کا اجتہاد بھی خطا جاتا ہے۔ مثلاً جملہ انبیاء بنی اسرائیل کا اجتہاد اس امر پر تھا کہ آخری نبی بنی اسرائیل میں پیدا ہو گا۔ مگر وہ نبی آخر الزمان بنی اسمٰعیل میں پیدا ہو گیا اور ان تمام انبیاء کا اجتہاد غلط نکلا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مقام دکھایا گیا۔ جہاں حضورؐ نے ہجرت کرنی تھی۔ آپ صلعم نے علاقہ کی سرسبزی اور وافر پانی سے قیافہ لگایا کہ ہم یمامہ کیطرف ہجرت کرینگے۔ لیکن جب ہجرت کا وقت آ گیا۔ تو حضور صلعم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ کا رخ کیا اور مدینہ جا پہنچے۔ اور اس کو بھی یمامہ کی طرح سرسبز و شاداب علاقہ پایا۔

حضرت مرزا صاحب نے آئینہ کمالات اسلام ص ۵۷۹ کے حاشیہ میں دو لفظ ذریت اور الصالحین تحریر فرماتے ہیں جہاں ذریت سے مراد اپنے بیٹے نہیں ہو سکتے بلکہ نسل مراد ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ حضور نے الوصیت میں فرمایا ہے: "خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ میں تیری جماعت کے لیئے تیری ہی ذریت سے ایک شخص کو قائم کرونگا اور اس کو اپنے قرب اور وحی سے مخصوص کرونگا اور اس کے ذریعہ سے حق ترقی کریگا اور بہت سے لوگ سچائی کو قبول کر لینگے۔"

اور تریاق القلوب ص ۴۲ کے فٹ نوٹ میں فرماتے ہیں:

"خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ میری پیشگوئی سے صرف اس زمانہ کے لوگ ہی فائدہ نہ اٹھائیں بلکہ بعض پیشگوئیاں ایسی ہوں کہ آئندہ زمانہ کے لوگوں کے لیئے ایک عظیم الشان نشان ہوں جیسا کہ براہین احمدیہ وغیرہ کتابوں کہ "میں تجھے اسی ۸۰ برس یا چند سال زیادہ یا اس سے کچھ کم عمر دونگا اور مخالفوں کے ہر الزام سے تجھے بری کرونگا۔ اور تجھے ایک بڑا خاندان بناؤنگا اور تجھ سے ایک عظیم الشان انسان پیدا کرونگا اور میرے تابعین سے دنیا بھر جائیگی اور وہ ہمیشہ دوسروں پر غالب آئینگے اور تو ہلاک نہیں ہو گا جب تک کہ راستی کے دلائل کو زمین پر قائم نہ کر لے اور جب تک کہ خبیث اور طیب میں فرق پیدا نہ ہو لے اور خدا تجھے اسقدر برکت دے گا کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈے گے"۔

حضور کی اس تحریر میں سے اسوقت میرا تعلق اس عظیم الشان انسان سے ہے جو آپ سے پیدا ہو گا۔ اب ظاہر ہے کہ وہ عظیم الشان یعنی مصلح موعود تا حال پیدا نہیں ہوا۔ اس لیئے ذریت سے مراد یہاں بہرطور نسل ہے نہ کہ اپنی صلبی اولاد۔ خود خلیفہ ثانی نے بھی اپنی کتاب "صادقوں کی روشنی کو کون دور کر سکتا ہے" میں یہ بات تسلیم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"تیسری بات جس پر اعتراض کیا جاتا ہے وہ پانچویں بیٹے کی پیشگوئی ہے جس کی نسبت مخالفین سلسلہ کا خیال ہے کہ وہ اب تک پوری نہیں ہوئی کیونکہ حضرت اقدس نے مواہب الرحمان کے صفحہ ۱۳۹ پر صاف طور سے لکھا تھا کہ بشرنی بخامس فی حین من الاحیان یعنی مجھے ایک پانچویں بیٹے کی بشارت دی گئی ہے" اور اسی طرح بہت سے الہامات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپکے ہاں ایک اور لڑکا پیدا ہونیوالا ہے۔ مثلاً انا نبشرک بغلام حلیم۔ ینزل منزل المبارک۔ ساھب لک غلام ذکیا۔ رب ھب لی ذریۃ طیبۃ۔ نبشرک بغلام اسمہ یحیی مظہر الحق والعلا۔ کان اللہ نزل من السماء پس اسکے بعد لازم ہے کہ ہر ایک الہام جو آئندہ بیٹے کی نسبت ہو وہ آئندہ نسل کے لئے ہو۔ اور پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ زبان کے لحاظ سے بھی بیٹا آئندہ نسل کے کسی فرد پر بھی بولا جا سکتا ہے۔۔۔ مگر حضرت صاحب کی نسل میں سے ایک بچہ کو اگر ان کا لڑکا قرار دیا گیا تو کون سا اندھیر آ گیا۔"

امید ہے اب لفظ بیٹا اور ذریت کے الفاظ میں کوئی ابہام نہیں رہ سکتا۔

دوسرا لفظ الصالحین آتا ہے۔ اس لفظ کے معنے سمجھنے کے لئے ہمیں قرآن حکیم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (۴ : ۶۹) "ترجمہ جو اللہ اور اسکے الرسول کی اطاعت کرتا ہے وہ ان لوگوں کے ساتھی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے۔

اہل ربوہ کے نزدیک صالح روحانیت کے لحاظ سے چوتھا درجہ ہے۔ اب میرا ان سے یہ سوال ہے کہ آیا حضرت مرزا صاحب نے

الصالحین سے مراد چوتھے درجے کی اولاد لی ہے۔ اور کیا وہ بیٹا جس کو حضور نے حسن و احسان میں اپنی نظیر، اولوالعزم، فضل عمر، مظہر الحق والعلاء، کان اللہ نزل من السماء بیان فرمایا ہے اور اپنا مشابہ اور اپنا بروز کامل لکھا ہے وہ منعم علیہ گروہ میں سے چوتھے درجہ کا انسان ہو گا۔ قرآن شریف میں حضرت نوح علیہ السلام کو من عبادنا الصالحین کہا گیا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو انعام دیا وہ تھا وَ وَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِيْنَ (۲۱ : ۷۲) اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے رب العزت کی حضور دعا مانگی تَوَفَّنِيْ مُسْلِماً وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ (۱۲ : ۱۰۱) اور سورہ انعام میں فرمایا وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۶ : ۸۶)۔ کیا یہ انبیاء بھی چوتھے درجے کے تھے ہرگز نہیں۔ وہ تمام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی تھے۔ اسلیئے حضرت مرزا صاحب نے جو لفظ الصالحین تحریر فرمایا ہے اس سے مراد وہ مامور من اللہ ہے جو مصلح موعود ہے۔ باقی اولاد ہرگز نہیں جو اس دنیا کے عام پھل آم کے مشابہ ہے۔ حضرت مرزا صاحب نے حضرت مولوی محمد علیؒ صاحب کو رویا میں دیکھا اور فرمایا آپ بھی صالح تھے اور نیک ارادے رکھتے تھے آؤ ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔ خدا تعالیٰ نے حضرت ممدوح کو صالح ظاہر کیا اور حضرت مرزا صاحب نے انہیں اپنے پاس بیٹھنے کو فرمایا۔ مگر عظیم باپ کی اس پاک رویا کے بالمقابل انکے بیٹے نے کیا مقام دیا۔ مولانا صاحب مرحوم تو اپنے مرشد کی نگاہ میں صالح ٹھہرے۔ لیکن حضور کے تینوں لمبی عمر پانیوالے بیٹے الہامات الٰہی میں یہ مقام پانے سے محروم رہے۔ فعتبروا یا اولوالابصار۔ الصالحین اسم معرفہ ہوتے ہیں اور صالحین اسم نکرہ دونوں میں فرق ظاہر ہے۔ صالحین میں سب سے نچلا درجہ قرآن شریف نے سورہ الانبیاء میں بیان فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱ : ۱۰۵)۔

حضرت مرزا صاحب اس آیت کی تفسیر ملفوظات روحانی خزائن جلد ۴ ص ۱۲۵ پر یوں فرماتے ہیں:

"اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ الارض سے مراد شام کی سرزمین ہے یہ صالحین کا ورثہ ہے اور جو اب تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ خدا تعالیٰ نے یرثها فرمایا یملکها نہیں فرمایا۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وارث اسکے مسلمان رہینگے اور اگر یہ کسی اور کے قبضہ میں کسی وقت چلی بھی جاوے تو وہ قبضہ اسی قسم کا ہو گا جیسے راہن اپنی چیز کا قبضہ مرتہن کو دے دیتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کی عظمت ہے۔ ارض شام چونکہ انبیاء کی سرزمین ہے اس لیئے اللہ تعالیٰ اس کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتا کہ وہ غیروں کی میراث ہو۔" یرثها عبادی الصلحین فرمایا۔ صالحین کے معنے یہ ہیں کہ کم از کم صالحیت کی بنیاد پر قدم ہو۔ اہل ربوہ کو چاہیے کہ ارض شام کے حالیہ حکمرانوں اور وہاں کے تمام مسلمانوں کو اس نوعیت کا صالح تسلیم کر لیں جو حضرت مرزا صاحب نے اوپر بیان فرمائی۔ اور تکفیر اہل قبلہ سے بھی توبہ کر لیں تاکہ اس سلسلہ ربانی کو عالم اسلام میں بالخصوص اور ساری دنیا میں بالعموم فروغ حاصل ہو۔

ابتک ذریت مبشرہ پر گفتگو منقولی اور نظریاتی طور پر کی گئی ہے۔ اس کا عملی پہلو باقی ہے۔ یہ بات ہم سب پر واضح ہے کہ انبیاء اور مامورین من اللہ کی قبل از دعویٰ زندگی اس قدر پاکیزہ ہوتی ہے کہ تمام وہ لوگ جن کے درمیان یہ پاک وجود بچپن اور جوانی گزارتے ہیں۔ وہ ان کے صادق امین اور نجیب ہونیکی گواہی دیتے ہیں۔ اور ان کے کسی فعل پر وہ انگلی نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن ان کے علاوہ جو لوگ ہیں خواہ وہ ولی اللہ ہی کیوں نہ ہوں ان کا بچپن اور جوانی بے داغ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ وہ لوگ نیک اور صالح بھی ہو سکتے ہیں اور کچھ عام دنیا دار قسم کے بھی۔ لیکن جب وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور حضرت احدیت کے آستانے پر اپنا سر عجز و انکساری سے رکھ کر اشکہائے ندامت و پشیمانی بہاتے ہیں اور صراط مستقیم پر چلنے کے لیئے اپنے خالق و مالک سے استعانت طلب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے۔ اور وہ انہیں اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ اور انہیں روحانی ترقی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ اور وہ لوگ جہد مسلسل سے فناہ فی الرسول اور فناہ فی اللہ ہو جاتے ہیں۔ اور انکے وجود انوار الٰہی کے مجسمے بن جاتے ہیں۔ اور تمام مدارج روحانی اللہ تعالیٰ کے صفت رحیمیت کے تحت ان کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ دنیا انکی حالت سے بے خبر نہیں رہتی۔ بلکہ کھچی ہوئی انکی طرف چلی آتی ہے۔ اور ان سے حسب استطاعت فیض حاصل کرتی ہے۔ ان اولیاء و صلحا پر اللہ تعالیٰ کی ایسی نظر کرم پڑتی ہے کہ وہ خاکی بشر ہونیکے باوجود سراپا نور بن جاتے ہیں۔

مجدد قیامت تک آتے رہیں گے

اقتباسات از ارشادات حضرت مسیح موعودؑ

مرتبہ ڈاکٹر زاہد عزیز، ایڈیٹر "لائٹ"

" پیغام صلح" نومبر ۱۹۹۴ء میں مرزا طاہر احمد صاحب سربراہ قادیانی جماعت کا بیان "الفضل" مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ء سے نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے دوران جمعہ خطبہ دیا کہ ان کے مطابق چودھویں صدی ہجری کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مجدد نہیں آئے گا کیونکہ تجدید کرنے والے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی اس لیئے کہ قادیانی سلسلہ خلافت نے ضرورت مجدد کو ختم کر دیا ہے۔

ہم قارئین پر واضح کرتے ہیں کہ یہ بیان حضرت مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعودؑ کے معتقدات کے قطعاً خلاف اور منافی ہے۔ آپ نے متعدد بار لکھا اور فرمایا کہ مجدد ہر صدی میں آتا ہے، اس کا آنا ضروری ہے اور مجدد قیامت تک آتے رہیں گے۔

حضرت اقدس مسیح موعودؑ کا پہلا حوالہ میں ذیل میں پیش کرتا ہوں:

۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء۔
قبل دوپہر
ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا آپ کے بعد مجدد آئے گا؟ اس پر فرمایا:

"اس میں کیا ہرج ہے کہ میرے بعد بھی کوئی مجدد آ جاوے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ختم ہو چکی تھی اس لئے مسیح علیہ السلام پر آپ کے خلفاء کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ قیامت تک ہے اس لئے اس میں قیامت تک مجدد دین آتے رہیں گے۔ اگر قیامت نے فنا کرنے سے چھوڑا تو کچھ نہیں کہ کوئی اور بھی آ جاتے گا۔ ہم ہرگز اس سے انکار نہیں کرتے کہ صالح اور ابرار لوگ آتے رہیں گے اور پھر بغتۃً قیامت آ جاتے گی۔ (روحانی خزائن نمبر ۲، جلد ۸، صفحہ ۱۱۹)۔

دیکھیئے یہ تقریر کتنی فیصلہ کن ہے! اور مجددین کے تا قیامت آنے کی وجہ آپ کیا دیتے ہیں؟ یہ کہ آنحضرت محمد رسول اللہؐ کا سلسلہ قیامت تک ہے۔ اگر مرزا طاہر احمد صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ چودھویں صدی ہجری تک تو اس سلسلہ کے مجددین آتے رہے مگر آئندہ نہیں آئیں گے تو اس کا یہی لازمی نتیجہ ہے کہ مرزا طاہر احمد صاحب کے نزدیک آنحضرت صلعم کی نبوت کا سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے اور ان کی خلافت ختم ہو چکی ہے۔ اب ان کی جگہ حضرت مرزا صاحب کی نبوت نے لے لی ہے اور تا قیامت اب حضرت مرزا صاحب کے ہی خلفاء آئینگے! نعوذ باللہ۔ قادیانیوں کے عقائد کا یہی لازمی نتیجہ نکلتا ہے اسی لئے حضرت مولانا محمد علی صاحب نے اختلاف کی ابتدا پر ہی اپنی انگریزی کتاب The Split میں تحریر کیا:

"میاں محمود احمد صاحب کی تعلیمات کے سب سے خطرناک نتائج یہ ہیں کہ اگر ان کے عقائد کو درست تسلیم کیا جائے تو حضرت مسیح موعودؑ کو ایک نئے دین کا بانی ماننا پڑتا ہے نہ کہ دین اسلام کا معلم جس کی تعلیم محمد رسول اللہ صلعم نے دی۔۔۔ کیا یہ واضح نہیں کہ جس طرح اسلام نے آ کر عیسائیت کی جگہ لے لی، اسی طرح میاں محمود احمد صاحب کا نیا اسلام محمد رسول اللہ صلعم کے پرانے اسلام کی جگہ لے لیتا ہے، گو اس میں شریعت پرانی ہی ہو؟"

اب ہم حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب کے مزید ارشادات کو پیش کرتے ہیں جہاں آپ نے مجددوں کے ہمیشہ آنے کی تعلیم دی ہے۔

(۱) کتاب "شہادۃ القرآن" میں آپ نے سیر کن بحث کی ہے کہ آنحضرت صلعم کے خلفاء، نائب رسول، روحانی معلم، محدث اور مجدد (یہ اصطلاحات آپ نے استعمال کی ہیں) دائمی طور پر آتے رہیں گے۔ آپ لکھتے ہیں:

"یہ بھی یاد رہے کہ ہر ایک زمانہ کے لیئے اتمام حجت بھی مختلف

رنگوں سے ہوا کرتا ہے اور مجدد وقت ان قوتوں اور ملکوں اور کمالات کے ساتھ آتا ہے جو موجودہ مفاسد کا اصلاح ان کمالات پر موقوف ہوتا ہے۔ سو ہمیشہ خدا تعالیٰ اسی طرح کرتا رہیگا جب تک اس کو منظور ہے کہ آثار رشد اور اصلاح کے دنیا میں باقی رہیں۔" (ص ۴۶)

یہاں صاف آپ نے فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ مجدد بھیجتا رہے گا۔

(۲) اسی طرح آپ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

"منجملہ ان کے ایک الذ کے لفظ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ لفظ مجددوں اور مرسلوں کے سلسلہ جاریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو قیامت تک جاری ہے۔ اب اس سلسلہ میں آنیوالے مجددوں کے خوارق، ان کی کامیابیوں، ان کی پاک تاثیروں وغیرہ وجوہات احکام آیات کو گن بھی نہیں سکتے۔

تابع کا کام متبوع کا ہی کام ہوتا ہے

اور یہ سب خوارق اور کامیابیاں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے متبعین مجددوں کے ذریعہ سے ہوئیں اور قیامت تک ہوں گی در حقیقت رسول اللہ صلعم کی ہی کامیابیاں ہیں"۔

(روحانی خزائن نمبر ۲، جلد ۲، ص ۶۳)

(۳) ہر صدی میں مجدد کی ضرورت کے متعلق حضرت اقدس مسیح موعودؑ فرماتے ہیں:-

"تعجب کی بات ہے کہ تجدید کا قانون یہ روزمرہ دیکھتے ہیں۔ ایک ہفتہ کے بعد کپڑے بھی میلے ہو جاتے ہیں اور ان کے دھلانے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کیا پوری صدی گزر جانے کے بعد بھی مجدد کی ضرورت نہیں ہوتی؟ ہوتی ہے اور ضرور ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کیا کہ ہر صدی کے سر پر ایک مجدد اصلاح خلق کے لئے آتا ہے کیونکہ صدی کے اس درمیانی حصہ میں بہت سی غلطیاں اور بدعتیں دین میں شامل کر لی جاتی ہیں اور خدا تعالیٰ کبھی پسند نہیں فرماتا کہ اس کے پاس دین میں خرابی رہ جاوے۔ اس لئے وہ ان کی اصلاح کی خاطر مجدد بھیج دیتا ہے"

(جلد ۳، ص ۲۵۴ - ۲۵۵)

(۴) ہر صدی میں مجدد کے آنے کو حضرت اقدسؑ "خدا تعالیٰ کی بات" قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

ہر صدی کے سر پر ایک مجدد کا ظہور

"میں جو کچھ اس وقت کہنا چاہتا ہوں وہ کوئی معمولی اور سرسری نگاہ سے دیکھنے کے قابل بات نہیں بلکہ بہت بڑی اور عظیم الشان بات ہے۔ میری اپنی بنائی ہوئی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی بات ہے۔ اس لئے جو اس کی تکذیب کے لئے جرات اور دلیری کرتا ہے وہ میری تکذیب نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب پر دلیر ہوتا ہے۔ مجھے اس کی تکذیب سے کوئی رنج نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس پر رحم ضرور آتا ہے کہ نادان اپنی نادانی سے خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔

یہ بات مسلمانوں میں ہر شخص جانتا ہے اور غالباً کسی کو بھی اس سے بے خبری نہ ہوگی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر ایک مجدد کو بھیجتا ہے جو دین کے اس حصہ کو تازہ کرتا ہے جس پر کوئی آفت آئی ہوتی ہے یہ سلسلہ مجددوں کے بھیجنے کا اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کے موافق ہے جو اس نے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون میں فرمایا ہے۔ پس اس وعدہ کے موافق اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس پیشگوئی کے موافق جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے وحی پاکر فرمائی تھی، یہ ضروری ہوا کہ اس صدی کے سر پر جس میں سے انیس برس گذر گئے کوئی مجدد اصلاح دین اور تجدید ملت کے لئے مبعوث ہوتا"۔ (جلد ۴، ص ۲)

حضرت مسیح موعودؑ تو یہاں فرماتے ہیں کہ مجددین کے آنے کا انکار کرنا تو اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کرنا اور رسول اللہ صلعم کی تکذیب پر دلیر ہونا ہے۔

(۵) جب حضرت مسیح موعودؑ سے یہ سوال پوچھا گیا:-

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہر صدی پر مجدد ہونا چاہیئے؟" تو آپ نے جواب میں فرمایا:-

حضرت اقدس۔ "ہاں یہ تو ضروری ہے کہ ہر صدی کے سر پر مجدد آتے۔ بعض لوگ اس بات کو سن کر پھر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب کہ ہر صدی پر مجدد آتا ہے تو پھر تیرہ صدیوں کے مجددوں کے

نام بتاؤ۔

میں اس کا پہلا جواب یہ دیتا ہوں کہ ان مجددوں کے نام بتانا میرا کام نہیں۔ یہ سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کرو جنہوں نے فرمایا ہے کہ ہر صدی پر مجدد آتا ہے اس حدیث کو تمام اکابر نے تسلیم کر لیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب بھی اس کو مانتے ہیں کہ یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور حدیث کی کتابیں جو موجود ہیں ان میں یہ حدیث پائی جاتی ہے۔ کسی نے کبھی اس کو پھینک نہ دیا اور نہ کہا کہ یہ حدیث نکال دینی چاہیئے۔ جبکہ یہ بات ہے تو پھر مجھ سے فہرست کیوں مانگی جاتی ہے"۔ (جلد ۵، ص ۱۰۰-۱۰۱)

یہی جواب ہم اب مرزا طاہر احمد صاحب کو دیتے ہیں جب وہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ پندرھویں صدی کا کوئی مجدد اب تک کیوں نہیں آیا۔ مجدد پیدا کرنا ہمارا کام نہیں ہے، اگر آپ کو اعتراض ہے تو آپ اپنا اعتراض آنحضرت صلعم کی حدیث پر کریں!

یہ تاریخی امر بھی قابل غور ہے کہ اکثر مجدد اپنی صدی کے سر پر نہیں بلکہ بعد میں آتے۔ مثلاً حضرت سید احمد بریلوی صاحبؒ تیرھویں صدی کے مجدد کی تو پیدائش ہی آغاز صدی کے ایک سال بعد ہوتی اور اس سے گذشتہ صدی کے مجدد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنی صدی کے آغاز کے چودہ سال بعد پیدا ہوتے۔ اس لیئے پندرھویں صدی کے متعلق اتنی جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے۔

حضرت اقدس کا جو جواب اوپر نقل کیا گیا ہے، اس کو جاری رکھتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:-

"میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ حدیث جھوٹی نہیں ہے صحیح ہے۔ یہ عام طور پر مشہور ہے کہ ہر صدی پر مجدد آتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں وغیرہ نے ۱۲ مجدد گن کر بھی دکھاتے ہیں مگر میں ان کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس حدیث کی صحت کا یہ معیار نہیں بلکہ قرآن اس کی صحت کا گواہ ہے۔ یہ حدیث **انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون** کی شرح ہے۔ صدی ایک عام آدمی کی عمر ہوتی ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ سو سال بعد کوئی نہ رہے گا۔ جیسے صدی جسم کو مارتی ہے اسی طرح ایک روحانی موت بھی واقع ہوتی ہے اس لئے صدی کے بعد ایک نئی ذریت پیدا ہو جاتی ہے جیسے اناج کے کھیت اب دیکھتے ہیں کہ ہرے بھرے ہیں۔ ایک وقت میں بالکل خشک ہوں گے پھر نئے سرے سے پیدا ہو جائینگے اس طرح پر ایک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پہلے اکابر سو سال کے اندر فوت ہو جاتے ہیں اس لئے خدا تعالیٰ ہر صدی پر نیا انتظام کر دیتا ہے جیسے رزق کا سامان کرتا ہے۔ پس قرآن کی حمایت کے ساتھ یہ حدیث تواتر کا حکم رکھتی ہے۔

کپڑا پہنتے ہیں تو اس کی بھی تجدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طریق پر نئی ذریت کو تازہ کرنے کے لیئے سنت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ ہر صدی پر مجدد آتا ہے" (ص ۱۰۱، ۱۰۲) تو جس امر اور حقیقت کو حضرت مسیح موعودؑ "سنت اللہ" قرار دیتے ہیں اور رسول کریمؐ کی پیشگوئی کہتے ہیں اور جس کے متعلق آپ یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ یہ "بہت بڑی اور عظیم الشان بات ہے" یعنی قیامت تک ہر صدی کے لیئے مجدد کا آنا، اسی کے متعلق مرزا طاہر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ فتنہ ہے جس کا سر ہمیشہ کے لیئے کچل دیا گیا ہے" اور یہ "جھوٹا پراپیگنڈا ہے جس کی قلعی کھل گئی ہے!"

اس سے ثابت ہوا کہ خلافت ربوہ تبھی قائم رہ سکتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ، رسول کریم صلعم اور مسیح موعودؑ کی باتوں کو جھٹلایا جائے۔

حضرت مسیح موعودؑ نے تو اپنی وفات سے ایک دن پہلے بھی کسی شخص کو جواب دیتے فرمایا:

"ہر صدی کے سر پر اس قسم کی غلطیوں کو مٹانے اور توجہ الی اللہ دلانے کے لیئے مجدد کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اگر ہر صدی پر مجدد کی ضرورت نہ تھی بلکہ بقول آپ کے قرآن کریم اور علماء کافی تھے تو پھر نبی کریم صلعم پر اعتراض آتا ہے۔ حج کرنے والے حج کو جاتے ہیں۔ زکوۃ بھی دیتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سو برس کے بعد مجدد آتے گا۔ (جلد ۱۰، ص ۴۵۲)۔

تبصرہ

قسط-۲

Qadiani Problem and position of Lahori Group by Dr. Mahmood A. Ghazi, published by Islamic Book Foundation, Faisal Masjid, P.O.Box 1453, Islamabad, 1991).

یعنی قادیانی مسئلہ اور لاہوری گروپ کی حیثیت۔

عرب ممالک کے ان سربراہوں کے پیغامات سے قادیانیوں کی غازی صاحب اور انکے ہمنوا پاکستانی علماء کے اس الزام سے پوری طرح بریت ہو جاتی ہے کہ مسلم امہ کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی مذموم سرگرمیوں میں وہ ملوث ہے۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی پاکستان کے اخبار بین احباب سے مخفی نہیں کہ جب چوہدری ظفر اللہ خان مرض الموت میں مبتلا تھے۔ تو عرب ممالک کے جملہ سفرا لاہور میں موصوف مرحوم کی عیادت اور بیمار پرسی کیلئے انکی جائے رہائش پر آتے رہے اور انکی جلد صحت یابی کی دعا کرتے اور اپنے اپنے ملک کے سربراہان کی طرف سے نیک تمناؤں کے پیغامات پہنچاتے رہے۔ اگر قادیانیوں کا یہودیوں خاص طور پر اسرائیلی حکومت اور برطانوی حکومت سے مسلم امہ کے خلاف گٹھ جوڑ ہوتا۔ تو اس گٹھ جوڑ کا علم پاکستان کے علماء اور مسلم مشاہیر کے مقابلہ عرب سربراہان اور سفراء کو بہت زیادہ ہوتا اور یہ انکی غیرت کے خلاف بات ہوتی۔ اگر وہ عرب دشمن جماعت کے ایک مقتدر شخصیت کی بیماری اور پھر وفات پر اسقدر اعلیٰ خراج تحسین پیش کرتے۔

یہاں میں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ قادیانیوں سے جماعت احمدیہ لاہور کا اعتقادات دین کی حد تک شدید اختلاف ہے اور یہ اختلاف ۱۹۱۴ء سے تا ایں دم مسلسل جاری ہے۔ مگر جو الزام ان پر خلاف واقعہ ہو اسکی تردید ہم اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس اخلاقی فرض میں کسی فرقہ اور جماعت کی تخصیص بھی نہیں کرتے۔

(۲) قادیانی تحریک مذہبی ہے یا مذہبی لبادہ میں سیاسی ہے۔

غازی صاحب احمدیہ تحریک کو سیاسی ثابت کرنے کے لیے دور کی کوڑی ڈھونڈ کر لاتے ہیں فرماتے ہیں۔ کہ یہ جماعت ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قدم مضبوط کرنے کیلئے مذہبی لبادہ میں قائم کی گئی تھی۔ انگریز مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے خوفزدہ تھا۔ اس نے حضرت مرزا غلام احمد کے ذریعے جہاد کو منسوخ کروا دیا اور اس سے دعویٰ نبوت کروا کے مسلمانوں کے ختم نبوت کے عقیدہ پر ضرب کاری لگائی۔ جہاد اور ختم نبوت یہ دو اصول ایسے تھے جن پر ساری اسلامی دنیا کا اتحاد و اتفاق قائم و برقرار تھا۔ اس مضبوط اتحاد اور یک جہتی کا قلع قمع کرنے کیلئے مرزا غلام احمد قادیانی انگریز کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا۔

ہم پہلے ختم نبوت کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

جماعت احمدیہ لاہور کا عقیدہ بالفاظ حضرت مرزا غلام احمد صاحب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ یعنی آپ پر سلسلہ نبوت و رسالت تاقیامت بند ہو گیا ہے اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ نہ نیا نہ پرانا۔ مگر تمام عالم اسلام باوجود ختم نبوت کو بنیادی عقیدہ قرار دینے کے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام جو رسول الی بنی اسرائیل تھے کسی زمانہ میں دوبارہ تشریف لائینگے۔ تمام کفار کا خاتمہ کر دینگے اور اسلام چار دانگ عالم میں پھیلا دینگے۔ چالیس سال حکومت کرینگے۔ پھر انکی موت واقع ہوگی۔ اور پھر قیامت آ جائیگی۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ختم نبوت کے صریحاً منافی ہے۔ کیونکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی پرانا نبی بھی آ جاتے تو آنحضرت صلعم آخری نبی نہیں رہے۔ آخری نبی

اس صورت میں مسیح ابن مریم ٹھہرینگے اور وہی خاتم النبین ہونگے۔ لہذا یہ عقیدہ قرآنی آیت **ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین وکان اللہ علیما حکیما** کے خلاف ہے اور رد کرنے کے قابل ہے اس عقیدہ کے ہوتے ہوتے یہ دعویٰ بلا دلیل ہے کہ ختم نبوت کے عقیدہ سے مسلمانوں کا اتحاد ملی قائم ہے۔ مسلمانوں نے اپنے اس غلط عقیدہ سے اتحاد ملی کا روز اول سے ہی خاتمہ کر دیا ہوا ہے۔

قادیانیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی سے نبی آسکتے ہیں۔ اس عقیدہ سے بھی ختم نبوت پر ویسے ہی زد پڑتی ہے جیسے مسیح ابن مریم کو دوبارہ لانے سے۔ اسلیئے جماعت احمدیہ لاہور اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے نزدیک دونوں گروہ یعنی اسلامی سواد اعظم اور قادیانی گروہ جادہ صواب پر قائم نہیں ہیں اور بالفعل دونوں ہی منکر ختم نبوت ہیں اگر اسلامی سواد اعظم ختم نبوت کو واقعی اسلام کا بنیادی عقیدہ قرار دیتے ہیں تو پھر انہیں حضرت مسیح ابن مریم کے نزول ثانی کا انکار کرنا پڑیگا۔ کیونکہ آنحضرت صلعم کا خاتم النبیین ہونا اور مسیح ابن مریم کا نزول ثانی صریحاً اجتماع ضدین ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہوگی کہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے اپنے مکتوب بنام چوہدری محمد احسن لکھا (خط محررہ ۷ اپریل ۱۹۳۲)۔ کہ مہدی کی آمد مسیح کے دوبارہ ظہور کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں اور قرآن کریم کی صحیح سپرٹ سے ان کا سروکار نہیں (اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۳۰-۲۳۱)۔ اسی طرح جب تک قادیانی گروہ اجرائے نبوت کے عقیدہ سے دست بردار نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابوت روحانی تا قیامت قائم نہیں رہتی۔ جماعت احمدیہ لاہور ان دونوں فریقوں کو مخلصانہ مشورہ دیتی ہے کہ اگر آپ ختم نبوت کو عالم اسلام کے اتحاد و اتفاق اور یک جہتی کا ذریعہ بنانے کے واقعی متمنی ہیں تو آپ دونوں ہی اپنے اپنے بے اصل عقیدہ سے دست بردار ہو جائیں اور اس عقیدہ کو بخوشی اپنا لیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا نہ نیا نہ پرانا۔ مزید گفتگو نبوت و رسالت کے باب میں کی جائیگی۔

مسئلہ جہاد اور احمدیت۔

ڈاکٹر غازی نے منسوخی جہاد بصورت قتال پر بڑے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے اور اسے اسلام کے خلاف ایک گہری سازش قرار دیا ہے۔ میری ان سے مودبانہ گذارش ہے کہ اگر انگریز نوازی اور سرکار انگریزی کی تعریف و توصیف اور اس سے کامل وفاداری اور اطاعت کا اظہار اور اسکے خلاف جنگ و جدل کو حرام قرار دینا یہ سب کچھ ایک جرم عظیم اور مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہے۔ تو پھر اس جرم اور سازش میں آپ کے جملہ قابل تعظیم علماء و فضلا اور مسلمان نامور مشاہیر حضرت مرزا صاحب کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ آپ تنہا مرزا صاحب پر فرد جرم نہ لگائیں۔ اپنے بزرگوں کو بھی خدا اور رسولؐ کی عدالت میں کھڑا کریں۔ آپ کی طرح آج بھی پاکستان میں علماء کا ایک گروہ موجود ہے جس کا تعلق فرقہ بریلوی سے ہے جو حضرت سید احمد بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کو بھی حضرت مرزا صاحب کی طرح انگریز نواز اور انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نواز احمد انور فریدی اپنی کتاب "۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو اور اسمعیلی تحریک جہاد کا پس منظر" میں ارشاد فرماتے ہیں:

"واقعات یوں ہیں کہ جب سلطنت مغلیہ پر زوال کا دور آیا اور انگریزوں کی ویسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں برسر اقتدار آنے لگی تو انگریزوں نے اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیئے ملکی فضاء کا جائزہ لیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک پنجاب میں سکھوں کی طاقت اور سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کی قوت کمزور نہ ہوگی اسوقت تک ہمارے قدم پوری طرح جم نہ سکینگے۔ اس مقصد کی تکمیل کیلیئے انگریز نے سعید احمد صاحب ساکن راتے بریلی اور مولوی اسمعیل صاحب دہلوی کو تاکا اور انہیں پٹی پڑھائی کہ تم مسلمانوں کو یہ تبلیغ کرو کہ انگریزوں سے جہاد ناجائز ہے اور عام مسلمانوں کو سکھوں کے مظالم کی داستانیں

سنا کر انہیں سکھوں سے جہاد کی تلقین کرو اور ساتھ ہی مسلمانوں کے بعض وہ اعمال جنہیں تم کفر و شرک کہتے ہو علی الاعلان بیان کر کے ایسے مسلمانوں کو کافر و مشرک قرار دو۔ جو ان کے مرتکب ہوتے ہیں۔ خصوصاً سرحدی علاقوں کے مسلمان عموماً اس قسم کے امور کو اچھا سمجھتے ہیں۔ لہذا نہ صرف سکھوں بلکہ سرحدی مسلمانوں سے بھی لڑو تا کہ یہ دونوں قوتیں کمزور ہو جائیں اور ہندوستان پر ہمارا تسلط پوری طرح قائم ہو جاتے"۔

(کتاب مذکورہ ص ۴)

اور سنیئے کیا فرماتے ہیں:

"ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب اور انکے رفقاء مجاہدین نے اسی ماحول میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی خاموش تبلیغ سارے ملک کے مسلمانوں میں کی اور انہیں منظم کر کے انگریز کے خلاف وہ شاندار جہاد کیا جس کی یادگار رہتی دنیا تک قائم رہیگی۔ آخر وہ کون سا امر تھا جو اسمعیلی گروہ کے لیے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے سے مانع رہا۔ زیادہ سے زیادہ یہاں بھی وہی نتیجہ برآمد ہوتا جو بظاہر سکھوں کے مقابلے میں جاکر برآمد ہوا۔ تو ظاہر ہے کہ اسکی ذمہ داری جہاد کرنیوالوں پر عائد نہیں ہوتی۔ اس نتیجہ کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ قادر مطلق سے ہے ورنہ کہنا پڑیگا کہ سکھوں کے مقابلے میں ناکامی کا وبال اسمٰعیلی گروہ کی گردن پر ہے۔ ہر نوع اسماعیلیات کے تحت یہ معمہ آج تک حل نہ ہو سکا کہ انگریز کے مقابلہ میں جہاد کی شدید ضرورت اور اس کے اسباب و وسائل پاتے جانے کے باوجود سکھوں کے نام نہاد مقابلے کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ کوئی عقلمند اسبات کو کبھی تسلیم نہ کریگا کہ اسکے گھر میں آگ لگی ہوئی ہو اور وہ اپنا گھر جلتا چھوڑ کر سینکڑوں میل کی مسافت پر دوسروں کی آگ بجھانے چلا جاتے۔

سوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

جو شخص اپنے گھر رہتے ہوتے انگریزوں سے جہاد نہ کر سکا وہ صدہا میل کے فاصلے پر سکھوں سے جہاد کرنے جا رہا ہے۔ سبحان اللہ۔

زکار زمین رانکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

(کتاب مذکورہ ص ۱۰۹)

پھر یہی صاحب مرزا حیرت دہلوی کی تصنیف "حیات طیبہ" مطبوعہ مطبع فاروقی، دہلی کے صفحہ ۲۹۶ کا مندرجہ ذیل اقتباس اپنی کتاب میں درج فرماتے ہیں:

"کلکتے میں جب مولانا (اسمٰعیل دہلوی) نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی۔ تو ایک شخص نے دریافت کیا کہ آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے۔ آپ نے جواب دیا کہ ان پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں۔ ایک تو ہم ان کی رعیت ہیں۔ دوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرہ بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے بلکہ اگر کوئی ان پر حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ (برطانیہ) پر آنچ نہ آنے دیں۔"

اور فرماتے ہیں: "دیکھا آپ نے کس طرح گورنمنٹ برطانیہ پر مسلمان کو قربان کیا جارہا ہے۔ کیا مرزا غلام احمد قادیانی کی انگریز دوستی سے اس دوستی کا وزن کچھ کم ہے۔"

ڈاکٹر ایم اے غازی نے بڑے طمطراق سے انگریز نوازی اور انگریز دوستی کا الزام حضرت مرزا صاحب پر لگایا ہے اور اس کا جو پس منظر انہوں نے بیان کیا ہے۔ انکی عبارت کا مقابلہ مولوی نور احمد انور فریدی صاحب کی عبارت سے دیکھ لیں۔ آپکو اور کچھ فرق دکھائی نہ دیگا۔ اگر تیرھویں صدی ہجری کا مجدد انگریز نواز، انگریز دوست تھا اور اس کے مقاصد سیاسی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے خرید آگیا تھا۔ اور اسکے باوجود وہ مجدد کا مجدد ہی رہا۔ تو پھر حضرت مرزا غلام احمد قادیانی پر یہ فرد جرم کیا معنی رکھتی ہے۔ انگریز کی عملداری سارے ہندوستان میں قائم ہونے سے تمام ہندی اقوام و ملل کو نہ صرف مال و جان اور آبرو کا تحفظ نصیب ہوا۔ بلکہ پوری مذہبی آزادی بھی حاصل ہو گئی۔ اور ہر طرح کا امن، سکون اور

اطمینان میسر آگیا۔ وہ مسلمان جو سکھوں کی ظالمانہ حکومت کا مزہ چکھ چکے تھے اور خوف و ہراس سے زندگی گذار چکے تھے۔ انہوں نے جب انگریز کا نہایت پر امن زمانہ پایا۔ تو انگریزوں کی تعریف و توصیف کرنے پر خود بخود مجبور ہو گئے اور انگریز کے نظام حکومت اور اسکی پر امن حکمت عملی کی کھل کر داد دی اور اپنی مکمل وفاداری کا یقین دلایا۔

آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ سر سید احمد خان انگریز کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ اور وہ حضرت مرزا صاحب کی انگریز نوازی کو کس آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ حضرت ممدوح نے ایک اشتہار ۱۸۹۷ء کو شائع فرمایا۔ جو سر سید احمد خان کو بھی پہنچا۔ اس اشتہار کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"اے نادانو! گورنمنٹ انگریزی کی تعریف تمہاری طرح میری قلم سے منافقانہ نہیں نکلتی۔ وہ لوگ سخت نمک حرام ہیں جو حکام انگریزی کے سامنے ان کی خوشامد کرتے ہیں اور ان کے آگے گرتے ہیں اور پھر گھر آ کر کہتے ہیں کہ جو شخص اس گورنمنٹ کا شکر کرتا ہے وہ کافر ہے۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ ہماری یہ کارروائی جو اس گورنمنٹ کی نسبت کی جاتی ہے منافقانہ نہیں ولعنۃ اللہ علی المنافقین۔ جبکہ ہمارا عقیدہ یہی ہے جو ہمارے دل میں ہے۔"

اس اشتہار کے ملتے ہی سر سید صاحب نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اپنے یہ ریمارکس شائع کئے:

"مرزا (غلام احمد) صاحب نے جو اشتہار ۱۸۹۷ء کو جاری کیا ہے اس اشتہار میں مرزا صاحب نے ایک لطیف عمدہ فقرہ گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری کی نسبت لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر مسلمان کو جو گورنمنٹ انگریزی کی رعیت ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسا کہ مرزا صاحب نے لکھا ہے۔ اس لیئے ہم اس اشتہار کو اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں۔

(منقول از کتاب اقبال اور احمدیت ص ۱۳۱ مصنفہ شیخ عبدالماجد)

گویا حضرت مرزا صاحب اور سر سید احمد خان صاحب دونوں کا موقف انگریزی حکومت کے بارے میں ایک تھا۔ لہذا سر سید صاحب بھی مرزا صاحب کی طرح انگریز کے ایجنٹ تھے بلکہ پہلے وہ ایجنٹ بنے اور بعد میں مرزا صاحب۔

اب ذرہ سر سید احمد خان صاحب کے بیانات بھی انگریز دوستی اور حکومت برطانیہ سے وفاداری کے متعلق ملاحظہ ہوں۔ سید صاحب نے ۱۸۸۴ء میں مسٹر بلنٹ (ممبر پارلیمنٹ انگلستان) کا جام صحت تجویز کرتے ہوئے اپنے ایڈریس میں فرمایا:

"ہم کو بہت خوشی ہے کہ آپ (مسٹر بلنٹ) نے ہمارے ملک کو دیکھا۔ ہماری قوم کے مختلف گروہوں سے ملے۔ ہم کو امید ہے کہ آپ نے ہر جگہ ہماری قوم کو تاج برطانیہ کا لائل اور کوئین وکٹوریہ ایمپریس انڈیا کا دلی خیر خواہ پایا ہو گا۔ وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی ایسا زمانہ تھا کہ بے چاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی اور اسے ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اس لئے خود انگلش فیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تاکہ گاسپل کے عہد نامہ کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں۔ انگلش فیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی۔ مگر مثل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ ایٹرنل رہے اور ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لیئے نہیں بلکہ خود اپنے ملک کے لیئے ہے" ("سر سید احمد خان کی کہانی سر سید احمد خان کی زبانی" از الطاف حسین حالی مؤلفہ ضیاء الدین لاہور، مطبوعہ ۱۹۸۲)۔

سر سید احمد خان کا شرعی نظریہ دربارہ حکومت برطانیہ

۱۸۸۴ء میں سر سید احمد خان پنجاب تشریف لاتے اور متعدد مقامات پر مسلمانوں کو خطاب فرمایا۔ آپ نے اہالیان جالندھر کے سپاسنامہ کے جواب میں ارشاد فرمایا: "میں نے گورنمنٹ کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ میں نے اپنے پاک مذہب اور سچے ہادی کے حکم کی تعمیل کی

ہے۔ ہمارے سچے ہادی نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ تم جس گورنمنٹ کے امن میں ہو اسکی اطاعت کرو اس کے خیر خواہ اور وفادار رہو۔ پس جو کچھ کہ گورنمنٹ کی خدمت مجھ سے ہوئی ہے۔ وہ حقیقت میں میرے مذہب کی خدمت تھی۔ آپ نے سنا ہو گا کہ ہمارے پیشوا نے کیا کہا تھا۔ اس نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ حاکم وقت، بادشاہ وقت کی اطاعت کرو۔ **ولو کان حبشا**۔ پس آپ خیال کیجئے کہ جب ہم کو ایک کالے منہ کے غلام بادشاہ کی اطاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ تو ہم ان گورے منہ والے حاکموں کی اطاعت سے کیوں منہ پھیریں" (سر سید احمد خان کا سفرنامہ پنجاب، ص ۶۵)۔

۱۸۸۷ء میں مولانا الطاف حسین حالی نے انگریزی حکومت کی شان میں جو قصیدہ لکھا۔ اسکے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گو منت قیصر سے ہے ہر قوم گراں بار
احسان مگر اسلام پہ ہیں اس کے گراں تر
گر برکتیں اس عہد کی سب کیجئے تحریر
کافی ہے نہ وقت اسکے لیئے اور نہ دفتر
قیصر کے گھرانوں پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

(کلیات نظم حالی، جلد ۱)

ملکہ وکٹوریہ کی ۱۹۰۱ء میں وفات پر مولانا نے ایک مرثیہ لکھا۔ اس حدیث نبوی **لا یشکر اللہ من لا یشکر الناس** کو شعر کا یوں لباس پہنایا تھا:

شکر بندوں کا خدا کے جو نہیں کرتے ادا
وہ نہیں لاتے بجا شکر خدائے ذوالجلال

مولانا حالی صاحب بھی انگریز کے ایجنٹ تھے۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کا قیام ۱۸۸۴ء میں ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ انتقال کر گئیں۔ اس انجمن کے سالانہ اجلاس میں ایک مرثیہ پڑھا گیا۔ اسکے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کر گئیں رحلت جہاں سے آسماں پے ہائے ہائے
دے گئیں صدمہ دل اہل جہان پہ ہائے ہائے
یا رب یوں ہیں کھڑے سب لاش شہنشاہ پاس
جس طرح مدہم ستارے صبحدم ہوں ماہ پاس
سایہ حق ہے نگہبانی کو ظل اللہ پاس
حاضر خدمت قدیمانہ ہے عزوجاہ پاس
سایۂ حق ان پہ تھا خود ظل سبحانی تھیں یہ
سارے عالم میں بڑی یکتا مہارانی تھیں یہ

صدر اجلاس شمس العلماء مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی تھے جو فقہ اسلامی کے جید عالم مشہور تھے۔ کیوں جناب انجمن حمایت اسلام لاہور جو جملہ اسلامیان پنجاب کی نمائندہ انجمن تھی اور جس کے اجلاس میں مولانا شبلی نعمانی، صغیر بلگرامی، خواجہ حسن نظامی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا سلیمان پھلواڑی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ڈپٹی نذیر احمد جیسے مشہور و معروف نابغہ روزگار شمولیت کیا کرتے تھے۔ انگریز پرست، انگریز نواز اور تاج برطانیہ کی وفاداری کا دم نہ بھرتی تھی۔ اس لحاظ سے اسلامیان پنجاب کو بھی انگریز کے ایجنٹوں میں شامل کر لیجئے۔ آگے چلیئے۔ گورنر آگرہ و اودھ نے ندوہ کا دورہ کیا۔ تو مولانا شبلی نے اپنی تقریر میں یہ فقرہ کہا:

"گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی کو ہم اپنا دینی فرض سمجھتے ہیں۔" (اخبار وکیل نمبر ۶۳، ۱۴ نومبر ۱۹۰۲)

اسکے جواب میں گورنر نے اپنے ایڈریس میں فرمایا:

"آپ لوگوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ اولوالامر یا حاکم وقت خدا ہی کے تعینات کردہ ہوتے ہیں اور کہ برٹش گورنمنٹ کے ساتھ وفاداری و جانثاری آپ کا مذہبی فرض ہے۔"

(اخبار وکیل ۱۴ نومبر ۱۹۱۴)۔

اب ذرہ دارالعلوم دیوبند کی طرف چلتے ہیں۔ رسالہ "دیوبند کی سیر اور اسکی مختصر تاریخ" مطبوعہ یکم ستمبر ۱۹۱۷ (پرنٹنگ ورکس دہلی) میں ارشاد ہوا۔

"ہر مومن مسلمان سے استدعا ہے کہ وہ گورنمنٹ عالیہ کے لیئے کہ جس کے عہد حکومت میں ہر فرد بشر نہایت عیش و آرام سے اپنی زندگی بسر کر رہا ہے اور اسکی عطا کردہ آزادی کی بدولت اسلامی چمنستان سر سبز و بار آور ہے۔ ضرور بالضرور دن

اور رات، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے غرض ہر لحظہ اور ہر ساعت میں دعا کریں۔ اے خدا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے مسند حکومت پر حکمران و قائم رکھ۔"

شائد دارالعلوم، دیو بند اور ندوہ کے بزرگوں کی دعاؤں کا ہی اعجاز تھا کہ برطانوی سامراج ۱۹۴۷ء تک برصغیر ہند میں قائم و برقرار رہا اور جب وہ ملک چھوڑ کر گیا تو انتقال اقتدار بھی نہایت ہی پر امن طریقہ سے ہوا۔ اگر تقسیم ہند کے موقع پر خونریزی ہوئی۔ تو وہ سب ہندوستانیوں نے خود ایک دوسرے کی کی اور یہ وحشت و بربریت اور سفاکیت و بہیمیت کی ایسی روح فرسا اور دلخراش داستان ہے کہ اس کا بدنما داغ ہر ہندو سکھ اور مسلمان کے ماتھے پر تا قیامت برقرار رہیگا۔

اب ہم اپنے مایہ ناز شاعر مشرق حکیم الامت حضرت علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال خالق تصور پاکستان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور ان سے بصد ادب و احترام دریافت کرتے ہیں کہ انگریزی حکومت اور تاج برطانیہ کے بارے میں انکے کیا جذبات تھے۔ پہلی جنگ عظیم عالمگیر کے موقعہ پر شہنشاہ برطانیہ کو آپ نے مخاطب کر کے شعری زبان میں قصیدہ مدحیہ لکھا۔ جس کا ایک بند درج ذیل ہے:

اے تاجدار خطۂ جنت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
محکم ترے قلم سے نظام جہان ہند
تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند
ہنگامہ غوغا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

پھر ۱۹۱۸ء میں انگریزی حکومت کے استقلال کے لیئے یہ دعا فرمائی۔

جب تک چمن کی جلوہ گل پر اساس ہے
جب تک فروغ لالہ ۔ احمر لباس ہے
جب تک نسیم صبح عنادل کو راس ہے
جب تک کلی کو قطرہ شبنم کی پیاس ہے

قائم رہے حکومت آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہین اسی طرح

ملاحظہ فرمایا آپ نے آسمان عالم فکر کے شاہین اقبال شہنشاہ جارج پنجم کی حضور میں اپنی وفاداری کے طور پر اپنا سر محقر بھی بطور نذرانہ پیش کر رہے ہیں اور سلطنت برطانیہ کی دائمی حکومت کی دعا کرتے نظر آرہے ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس دور میں علامہ اقبال ہمیں ان علماء و زعما کے زبردست حامی دکھائی دیتے ہیں جن کے نزدیک سرکار برطانیہ کی اطاعت و وفاداری شرعی بنیادوں پر ضروری تھی۔ چنانچہ لاہور کے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس کا مقصد حکومت برطانیہ کی جنگی مصارف کے لیئے روپیہ جمع کرنا اور فوجی بھرتی تھا۔ جلسہ میں علامہ اقبال سمیت مسلم و غیر مسلم، سرکاری و غیر سرکاری عمائدین تمام اضلاع حاضر تھے۔

مولوی رحیم بخش، پریذیڈنٹ کونسل، بہاولپور نے جلسہ میں مسلمانوں کے عقیدہ کے حوالہ سے کہا:

"ہمارے عقیدہ میں شہنشاہ ظل اللہ ہے۔ اسکے حکم کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھنا چاہیئے۔ اسلام کی نیشنیلٹی **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ہے اسلام کی برادری سب مسلمانوں کو بھائی سمجھتی ہے۔" (پیسہ اخبار، لاہور ۱۱ مئی ۱۹۱۸)

پھر جلسہ میں مولوی رحیم بخش صاحب نے مولانا رشید احمد گنگوہی کا شرعی فتویٰ پڑھ کر سنایا۔ جو یہ تھا۔ "جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ملک حبشہ میں جو مقبوضہ نصاریٰ تھا۔ بھیج دیا اور یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ کسی کے مذہب میں دست اندازی نہیں کرتے تھے۔"

"اور جب مسلمان رعایا بن کر ہندوستان میں رہے اور حکام سے عہد و پیمان کر چکے کہ کسی حاکم یا رعایا و حکام کے جان و مال میں دست اندازی نہیں کرینگے اور کوئی امر خلاف اطاعت نہ کریں گے تو مسلمانوں کا خلاف عہد و پیمان کرنا یا کسی قسم کی خیانت مخالف حکام کرنا ہرگز درست نہیں۔ عہد کے پورا کرنے کی مسلمانوں کے مذہب میں اس قدر تاکید ہے کہ شائد

ہی دوسرے مذہب میں ہو۔ وقال اللہ تعالیٰ و اوفو بالعہد ان العہد کان مسولا میں بروز قیامت باز پرس ہوگی۔ عہد شکنی کی سخت ممانعت ہے اور کسی سے عہد کر کے اس کے خلاف کرنے پر بہت دھمکی دی گئی ہے۔"

(پیسہ اخبار، ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء)۔

اسی جلسہ میں ایک نہایت اہم ریزولیوشن منظور کرانا بھی پیش نظر تھا اور وہ پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ بھرتی کرنے کے بارے میں تھا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کا صادر کردہ فتویٰ پڑھا جا چکا تھا۔ اب حاضرین میں جوش و خروش پیدا کرنے کی غرض سے علامہ اقبال نے اپنی نظم "پنجاب کا جواب" پیش کر کے پوری کر دی۔ پھر بھرتی کے بارے میں ریزولیوشن میجر ملک سر عمر حیات خان ٹوانہ نے حسب ذیل پیش کیا۔

(۲) اس جلسہ کی رائے ہے کہ

(الف) اس سال میں جو یکم اپریل ۱۹۱۸ء سے شروع ہوتا ہے پنجاب دو لاکھ رنگروٹ بہم پہنچاتے۔

یہ ریزولیوشن بغیر کسی حیث بحث کے منظور ہو گیا۔

(پیسہ اخبار، ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء)۔

پنجاب کے گورنر سر مائیکل ایڈوائر نے جب دیکھا کہ مسلمانان پنجاب نے وفاداری کا ایسا زوردار ثبوت بڑی کثرت سے بھرتی دیکر کیا ہے تو حیرت و انبساط کے ملے جلے جذبات سے اعتراف کیا

"The Punjab Mohammedans went to fight in Mesopotamia, Palestine and Egypt in a spirit of loyal duty."

پنجاب کے مسلمان عراق، عرب، فلسطین اور مصر میں لائل ڈیوٹی کے جذبہ سے لڑنے کے لیئے پہنچے۔"

(India As I Knew It by Sir Michael O'Dwyer published by London Constable & Co. Ltd., 1925, p.415)

گورنر مذکور نے اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۲۱۵ پر لکھا:

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پنجاب کی نصف سے زیادہ آبادی مسلمان ہے اور جن لوگوں کو دیہاتی مسلمانوں کا صرف سطحی علم تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ایسی جنگ کے لیئے جو ترکوں کے خلاف تھی اور جو مصر، فلسطین اور عراق جیسے اسلامی ممالک میں جہاں کہ اسلامی مقدس مقامات ہیں۔ لڑی جا رہی ہے مسلمان بھرتی نہیں ہونگے۔ لیکن یہ سب مایوسانہ خیالات باطل ثابت ہوتے۔ جنگ کی ابتدا میں صرف ایک لاکھ پنجابی سپاہی تھا لیکن جنگ کے خاتمہ تک پانچ لاکھ فوجی خدمت کر چکا تھا۔ دوران جنگ اندازاً تین لاکھ ساٹھ ہزار سپاہی بھرتی ہوا تھا جو کہ کل ہندوستان کی بھرتی کے نصف سے بھی زائد تھا اور ان میں سے نصف پنجاب کے مسلمان تھے جو اس علم کے ساتھ بھرتی ہو رہے تھے کہ وہ ترکوں کے خلاف جنگ کرنے جا رہے ہیں۔"

مندرجہ بالا وہ ٹھوس حقائق ہیں کہ غازی صاحب اور دوسرے تمام معاندین تحریک احمدیت اگر چھپانے کی عمر بھر کوشش کرتے رہیں تو کبھی چھپا نہ سکیں گے۔ ان حضرات کو اپنے علماء زعماء و عمائدین، مشاہیر اور نامی گرامی دانشوروں کے چہرے ان تحریرات کے آئینے میں اچھی طرح نظر آ سکتے ہیں۔ غازی صاحب کو کسی قادیانی کی اس تحریر سے کہ سلطنت عثمانیہ کی تباہی اسلیئے آئی کہ اس نے مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت سے انکار کیا تھا بڑی چبھن محسوس ہوتی ہے۔ مگر اپنے ان لاکھوں بھائی بندوں اور کلمہ گوؤں کی طرف ایک لحہ کیلئے بھی دھیان نہیں گیا۔ جو ترکوں، مصریوں، فلسطینیوں، عربوں اور عراقیوں پر گولیاں اور بم برسانے پنجاب اور ہندوستان سے گئے تھے اور ان کی جرات اور بہادری کے نتیجے میں یہ تمام اسلامی ممالک برطانیہ کے قبضے میں آ گئے تھے۔ بڑے ہی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے مخالف سمندر میں بڑی مچھلیوں کو تو پوری آزادی سے گھومتا پھرتا دیکھتے ہیں اور کوئی تعرض نہیں کرتے۔ مگر غریب چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے خلاف واویلا مچاتے ہیں کہ دیکھو ان مچھلیوں نے سمندر کے پانی کو کیسے گندہ کر رکھا ہے۔ ان کا فی الفور صفایا کر دیا جاتے۔ غازی صاحب نے خود ہی زنبور کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تھا۔ مگر ان کو اب معلوم ہو گیا ہو گا کہ اب ان کا ہاتھ چھتے سے صحیح سلامت

باہر نہیں آ سکتا۔ حضرت مرزا صاحب نے اپنے مخالفوں کو کیا خوب کہا تھا۔

کچھ تو خوف خدا کرو لوگو
کچھ تو لوگو خدا سے شرماؤ

اور پھر للکار کر کہا تھا

جو خدا کا ہے اسے چھیڑنا اچھا نہیں
ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے روبہ زار و نزار

بقول غازی صاحب علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے پہلی بار یہ انکشاف کیا تھا کہ جماعت احمدیہ ایک دشمن اسلام سیاسی تحریک ہے۔ ذرہ انکے استاد مکرم شمس العلماء حضرت سید میر حسن صاحب سیالکوٹی کی انگریز نوازی بھی ملاحظہ فرماتی جاتے۔ "رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہر نعمت کا شکر کرنے کے متعلق تعلیم فرماتی ہے اور اپنے حکام وقت کی اطاعت اور فرمانبرداری کی ہدایت فرماتی ہے۔ پس جب حکام وقت کی اطاعت کریں اور اس نعمت عظمیٰ کا شکر کریں تو ہم اپنے پاک رسول صلعم کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں ہمارے شفیع و رہنما حضرت رسول مقبول صلعم عادل بادشاہ کو ظل اللہ کے لفظ سے تعبیر فرماتے ہیں اور عادل بادشاہ کے زمانے میں جو مذہباً مجوسی تھا اپنے پیدا ہونے پر فخر کرتے ہیں اور **لا یشکر اللہ من لا یشکر الناس** فرما کر انسان کے شکر گزار کو خدا کا شکر گزار ثابت کرتے ہیں۔ تو ہم کو اپنی مہربان (انگریز) عادل علیا حضرت قیصرہ ہند کے وجود باجود کو نعمت الہیٰ سمجھنا اور اس کے اوصاف جمیلہ کا تذکرہ کرنا اور اسکے عہد میں پیدا ہونے پر فخر کرنا اور اس کے زیر سایہ امن کے ساتھ رہنے کا شکر ادا کرنا موجب سعادت دارین ہے۔" (شمس العلما مولانا سید میر حسن کے حیات وافکار، اقبال اکیڈمی، پاکستان ص ص ۸۰۔ ۸۹)۔

سید صاحب موصوف نے در حقیقت یہ شرعی فتویٰ انگریزی حکومت کی اطاعت اور وفاداری کے سلسلہ میں دیا تھا۔ علامہ ڈاکٹر اقبال کی نگاہ میں اپنے اس استاد کی کیا قدر و قیمت تھی وہ بھی سن لیں۔

"اسوہ رسولؐ پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص کا عمل ہے تو وہ مولانا سید میر حسن ہیں"۔ اور پھر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو

مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس میں یہ اشعار سرکار انگریزی کی شان میں لکھے۔

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں
ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں ہر سمت سے آ رہی ہیں
کہ راجہ سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا
نمازیں خوشی سے پڑھو مسجدوں میں
اذانیں دھڑلے سے دو مسجدوں میں

مولانا ظفر علی خان بھی جو سخت معاند احمدیت تھے۔ انگریز کے قصیدہ خواں تھے اور مدح سرائی میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ ان کا یہ شعر ہی ہمارے مخالفوں کی آنکھوں کیلئے سرمہ بصیرت ہے:

تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار

ہمارے پاس علماء دین شرع متین، مشائخ عظام، مسلم زعما، مسلم مشاہر کی انگریز نوازی اس سے کامل وفاداری، اطاعت اور تاج برطانیہ کی خاطر جان و مال کی قربانی کے بارے میں قصائد اور فتاوی کا ایک انبار پڑا ہوا ہے جس میں سے کچھ کے اقتباسات اوراق گزشتہ میں درج کئے گئے ہیں تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ انگریز کے ہندوستان پر تسلط قائم ہو جانے پر مسلمانوں کا مجموعی طور پر کیا رد عمل تھا اور سب پر بخوبی عیاں ہو گیا ہو گا کہ تمام مسلمان راہنماؤں نے انگریزی حکومت کا تہ دل سے خیر مقدم کیا تھا اور جب انگریزوں پر کبھی مصیبت کا وقت آیا تو مسلمان بکثرت انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر اسلامی ممالک میں جا کر اپنے کلمہ گو مسلمان بھائیوں کے خلاف بڑی

بے جگری سے لڑے اور تاج برطانیہ کی حفاظت کیلئے اپنی جانوں کی بے مثال قربانی دی۔ جب مسلمانان ہند کی انگریز سے وفاداری کا یہ عالم تھا۔ تو پھر انگریز کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ کسی خاص شخص کو اپنا ایجنٹ مقرر کرتے۔ آئیے بات کو اور آگے بڑھاتے ہیں۔

یکم نومبر ۱۸۸۵ کو الہ آباد کے دربار میں ملکہ وکٹوریہ کا یہ اعلان کیا گیا۔

"مذہبی عقیدہ اور رسوم کی بنا پر نہ تو کسی کو رعائت کا مستحق سمجھا جائے نہ کسی کو تنگ کیا جائے۔ قانون کی نظر میں عام لوگ غیر جانبدار رنگ میں پوری حفاظت کے حقدار ہونگے"۔ اس پر سر سید احمد خان صاحب نے لکھا: "بے شک ہماری ملکہ معظمہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے۔ بے شک یہ پر رحم اشتہار الہام سے جاری ہوا ہے۔

(مقالات سر سید، حصہ نہم، ص ۱۰۶ مطبوعہ ۱۹۶۲ انجمن ترقی ادب لاہور)

ڈاکٹر ایم اے غازی اور انکے ہمنوا دشمنان احمدیت کے نزدیک سر سید احمد خان بڑے عالی مقام انسان تھے اور طوفانی سمندر میں مسلمانان ہند کی کشتی کے ناخدا تھے۔ بڑے عالم و فاضل ذہین و فطین اور اعلےٰ ترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان بزرگوار نے تو مرزا صاحب کی جماعت کا وجود قائم ہونے سے کئی سال قبل ہی تاج برطانیہ کی ہند میں حکومت کے قدم مضبوط کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہوا تھا اور اس خدمت کو اپنے دین یعنی اسلام کی خدمت قرار دیا ہوا تھا۔ پھر ان کا یہ کہنا کہ برطانوی حکومت کے تسلط کو مستحکم کرنے کی غرض سے انگریز کی نگاہ مرزا غلام احمد قادیانی پر پڑی کہاں تک مبنی بر حقیقت و انصاف ہے۔ جبکہ ان علماء کے نزدیک مرزا صاحب ایک مخبوط الحواس، مالیخولیا زدہ انسان تھا جو امراض خبیثہ میں مبتلا تھا۔ اور تعلیمی لحاظ سے اسقدر گیا گذرا ہوا تھا کہ سوائے فارسی اور عربی کی چند ابتدائی کتب پڑھنے کے اور کچھ بھی سرمایہ علم نہ رکھتا تھا۔ یہ ان کا کتنا لایعنی اور غیر معقول الزام ہے۔ انگریز مدبرین اور سیاست دان ایسے نادان نہ تھے کہ اتنے عظیم اور کٹھن مقصد کے لیئے انکی نظر انتخاب ایسے شخص پر پڑتی جس میں قابلیت کا کوئی جوہر ہی نہیں تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ کسی زیرک، باہوش، صاحب عقل و خرد، صاحب علم و فضل اور پورے صحت مند آدمی کا انتخاب کرتے۔ ان کے پاس سر سید احمد خان، مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور بیشمار نواب راجے مہاراجے، بڑے بڑے جاگیردار اور طاقتور زمیندار موجود تھے۔ جنہیں انگریزی حکومت سے مکمل وفاداری کے عوض بڑی بڑی ریاستیں، جاگیریں، رقبات اراضی، نقد انعامات اور طرح طرح کے خطابات سے نوازا ہوا تھا۔ ڈاکٹر غازی کا اخلاقی فرض تھا اور ہے کہ وہ پبلک پر یہ بھی ظاہر کرتے کہ حکومت برطانیہ کی خدمت کے صلہ میں مرزا صاحب کو انگریز نے فلاں فلاں مراعات عطا کیں۔ فلاں فلاں خطابات دیئے۔ مگر ان کے پاس کچھ ہوتا تو وہ پبلک کو ضرور بتاتے۔ یونہی ایک ایسی بات کا کہدینا جس کا کوئی ثبوت نہ ہو آخر کہاں کی شرافت اور دیانتداری ہے۔